

سیرۃ امام ابو حنیفہؒ

(اتہام شیعیت کی حقیقت)

مؤلف

مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

اعداد و تقدیم

محمد فہد حارث



حارث پبلی کیشنز



سیرۃ امام ابوحنیفہؒ (اتہام شیعیت کی حقیقت)

مؤلف:

مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

اعداد و تقدیم:

محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

نام کتاب	سیرۃ امام ابوحنیفہؒ
نام مؤلف	مولانا علی احمد عباسی
مطبوعہ	حارث پبلی کیشنز
سال طباعت	مارچ ۲۰۱۹ء
تعداد	۵۰۰
قیمت	۴۰۰/-

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۹	محمد فہد حارث	☆ تقدیم
۱۱	ہمارے فقہاء کی جزری	
۱۳	ہمارے محدثین کا تفقہ فی الدین	
۱۷	امام ابو حنیفہؒ اور تفقہ فی الدین	
۲۰	مسلم کی تعصب اور شخصیات	
۲۲	فقہی مذاہب اور خلفائے اسلام	
۲۶	امام ابو حنیفہؒ اور زید بن علی کا خروج	
۳۳	امام ابو حنیفہؒ اور ائمہ شیعہ کی شاگردی	
۳۶	امام ابو حنیفہؒ اور شیعیت	
۳۸	زیر نظر کتاب کی وجہ طباعتِ ثانی	
۳۹	تعارفِ مصنف	
۴۳	محمود احمد عباسی تعارف
۵۳	علی احمد عباسی پیش لفظ
۵۸	شخصیت امام اعظم ابو حنیفہؒ	☆

۵۸	نام و نسب	۱۔
۶۰	حیثیت عرفی	۲۔
۶۳	کوفہ	۳۔
۶۷	مواقف اساتذہ	۴۔
۶۹	اشیوخ والفقہاء	۵۔
۷۵	☆ امام ابوحنیفہؒ اور سیاسی ہنگامے	
۷۷	۶۔ امام ابوحنیفہؒ اور زید بن علی بن الحسین	
۸۵	انتباہ	۷۔
۸۷	۸۔ امام ابوحنیفہؒ اور امیر ابن ہبیرہ	
۹۱	۹۔ امام ابوحنیفہؒ اور امیر حسن بن قطنہ	
۹۶	۱۰۔ امام ابوحنیفہؒ اور محمد الارقط حسینی	
۱۰۰	۱۱۔ ایک اور افتراء	
۱۰۵	۱۲۔ یعقوبی افسانہ	
۱۰۶	۱۳۔ امام ابوحنیفہؒ اور ابراہیم حنسی	
۱۱۲	حوالہ جات
۱۱۴	☆ امیر المومنین المنصورؒ، امام ابوحنیفہؒ اور مکتبہ حنفیہ	
۱۱۵	۱۴۔ حرکت علمی	
۱۱۸	۱۵۔ عرف	
۱۲۲	۱۶۔ امام مالک	
۱۲۲	۱۷۔ محمد بن اسحاق	
۱۲۲	۱۸۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ	
۱۲۴	۱۹۔ تحریری کام	
۱۲۵	۲۰۔ کتاب الآثار	

۱۲۶	امام صاحب کی کتابیں	۲۱۔
۱۲۹	فقہ حنفی	۲۲۔
۱۳۲	مکتبہ حنفیہ	۲۳۔
۱۳۳	تلامذہ امام	۲۴۔
۱۳۸	اصحاب امام مالکؒ	۲۵۔
۱۴۰	دیگر ائمہ	۲۶۔
۱۴۵	وفات امام	۲۷۔
۱۴۹	تدفین	۲۸۔
۱۵۲	حوالہ جات
۱۵۳	☆ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور شیعیت	
۱۷۸	اخذ روایت میں سختی	۲۹۔
۱۸۰	موافق اقربائے حسینؑ	۳۰۔
۱۸۴	دعوت عباسیہ اور آل عبد مناف ابو طالب	۳۱۔
۱۸۹	واہی افتراء	۳۲۔
۱۹۱	سیاہ رنگ	۳۳۔
۱۹۲	اموی سادات	۳۴۔
۱۹۷	علوی سادات	۳۵۔
۲۰۴	اندلس کی اموی امارت و خلافت	۳۶۔
۲۰۹	حوالہ جات
۲۱۲	☆ اختلاف مذاہب	
۲۱۴	ایک قابل توجہ جائزہ	۳۷۔

انتساب

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

کے نام

جن کی علمی کاوشوں سے یہ احقر ہمیشہ مستفید ہوتا رہا ہے۔ اعتدال
کیا ہوتا ہے، دین کیسے سمجھنا ہے، حکمت کیا ہوتی ہے، اور باشعور
تحریر کسے کہتے ہیں، یہ سب اس احقر نے حافظ صلاح الدین
یوسف حفظہ اللہ کی تحاریر سے سیکھا ہے۔ اللہ ان کا سایہ اس احقر
کے سر پر تازیت سلامت رکھے۔

تقدیم

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سن ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے، ان کے اساتذہ میں حماد بن سلیمان اور عطاء بن ابی رباح شامل ہیں، جبکہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ یہ وہی امام محمد بن حسن شیبانی ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کے انتقال کے بعد امام مالک بن انس رحمہ اللہ (ولادت ۹۳ ہجری) کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا اور ان کو یہ شرف حاصل رہا کہ فقہائے اربعہ میں سے پہلے دو حضرات کے یہ براہ راست شاگرد تھے۔ انہیں امام محمد بن حسن شیبانی کے ایک ہم سبق امام محمد بن ادیس الشافعی (ولادت ۱۵۰ ہجری) تھے جو کہ امام مالک بن انس کے شاگرد تھے۔ گویا ایک واسطے یعنی امام محمد بن حسن شیبانی کے ذریعے امام شافعی کو امام ابوحنیفہ کی فقہ سے بھی استفادے کا موقع ملا تو دوسری طرف براہ راست امام مالک کی فقہ سے بھی مستفید ہوئے۔ جبکہ امام مالک کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ فقہ اربعہ کے دو اماموں کے وہ براہ راست استاد رہے یعنی امام شافعی و امام محمد۔ اسی طرح سے امام شافعی کے شاگرد امام احمد بن حنبل (ولادت ۱۶۴ ہجری) تھے۔ گویا امام احمد بن حنبل کو براہ راست امام شافعی کی فقہ جاننے کا موقع ملا اور بالواسطہ یعنی امام شافعی کے ذریعے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کی فقہ سے بھی مستفید ہوئے۔

امام احمد بن حنبل کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کا موقع امام بخاری (ولادت ۱۹۴ ہجری) کو حاصل رہا جبکہ انہیں امام بخاری کی شاگردی کا شرف امام مسلم (ولادت ۲۰۴ ہجری) کو

حاصل تھا۔ یاد رہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے بیشتر اساتذہ مشترک تھے جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور امام بخاری بن معین۔ اسی طرح سے امام ترمذی کو بھی براہ راست امام بخاری و امام مسلم کی شاگردی کا شرف حاصل رہا جبکہ امام ابن ماجہ کو امام مسلم کے استاد امام ابو زرعہ رازی کی شاگردی و سرپرستی حاصل رہی۔ انہیں امام ابن ماجہ کے ایک اور استاد امام ابو بکر ابن ابی شیبہ تھے جو کہ امام ابن ماجہ کے ساتھ ساتھ امام ابو داؤد کے بھی استاد تھے۔ جبکہ امام نسائی کو امام ابو داؤد اور امام قتیبہ بن سعید سے استفادہ کا موقع ملا جبکہ امام ابو جعفر طحاوی امام نسائی کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔

المختصر اس دقیق و گنجگ تفصیل کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ہمارا علمی ورثہ خیر القرون کے دور سے اس قدر مربوط اور ایک دوسرے سے جڑا ہے کہ نہ صرف چاروں ائمہ ایک دوسرے سے باہم مربوط اور مستفید رہے بلکہ فقہائے اربعہ کا یہ سلسلہ آگے بڑھ کر محدثین سے ملا اور پھر ہمارے صحاح ستہ کے تمام مولفین بھی اسی ربط و سلسلے سے باہم جڑے رہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی فقیہ یا محدث کہیں بیچ میں بغیر کسی ربط کے آگیا ہو۔ یہی وجہ رہی کہ ان ائمہ و محدثین کے زمانے میں قواعد اصولیہ کے تحت شدید فقہی و فروعی اختلاف کے باوجود یہ ائمہ اور ان کے براہ راست شاگرد ایک دوسرے سے نہ صرف مستفید ہوتے رہے بلکہ ایک دوسرے کی بے پناہ عزت و احترام بھی کرتے رہے۔ ظاہری بات ہے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طریقے سے دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر امام ترمذی کو لے لیں، جو کہ امام بخاری کے شاگرد تھے، جبکہ امام بخاری امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے، امام احمد بن حنبل امام شافعی کے شاگرد تھے، امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی ہم سبق تھے اور امام مالک کے تلامذہ میں شامل تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے جبکہ امام ابو حنیفہ کو امام حماد بن ابی سلیمان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، امام حماد امام ابراہیم نخعی کے شاگرد خاص تھے، جبکہ امام ابراہیم نخعی کو امام علقمہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کا موقع ملا جو کہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد خاص تھے اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بقول سیدنا ابو موسیٰ اشعرؓ نبی کریم ﷺ کے اہلبیت میں شامل فرد اور قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے صحابی تھے۔ سو یوں یہ سلسلہ الذہب صحاح ستہ

کے مولفین سے لے کر نبی کریم ﷺ تک بمعہ جدید ترین واسطوں کے پہنچ جاتا ہے، اور یہی ایک بات کافی ہونی چاہیے متجددین کے بودے دلائل کے ابطال کے لئے جو کہ احادیث کو نبی ﷺ کے انتقال کے ڈھائی سو سال کے بعد کا بتانے کی سعی لاحاصل اور ہمارے فقہاء کو محدثین سے برگشتہ دکھانے کی مذموم کوششیں کرتے ہیں۔

ہمارے فقہاء کی جزر سی

پھر یہ متجددین اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ہمارے فقہاء پر معترض ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی فقہاء مرتب کرتے ہوئے انسانی جان، ضروریات اور حریت کا اس طور سے خیال نہیں کیا جس طور سے خیال ان کے ”استاد محترم“ اپنی جدید فقہ کی تدوین میں کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات سے مکمل حسن ظن رکھتے ہوئے ان کے اس اعتراض کو ہم دو باتوں پر قیاس کرتے ہیں، آیا انہوں نے کبھی ”روایت پرست“ قدیم و جدید فقہاء کی کتب کا مطالعہ نہیں کیا، اور اگر کیا ہے تو پھر وہ ان کتب کے مندرجات سمجھنے سے قاصر رہے۔ ائمہ اربعہ کی فقہ سے لے کر ظاہریہ و زیدیہ فقہاء تک میں انسانی جان، ضروریات، حریت حتیٰ کہ علم تک کا جس طور سے خیال رکھا گیا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ کے کسی بھی مدون قانون میں ملنا محال ہے۔ زیادہ نہیں، اگر ہمارے ان متجددین حضرات نے صرف علامہ ابن قدامہ حنبلی کی المغنی، علامہ عبید اللہ بن سلام کی کتاب الاموال، الدر المختار بمعہ حاشیہ ابن عابدین، النووی کی المجموع، ابن نجیم المصری کی البحر الرائق جو کہ امام عبداللہ بن احمد نسفی کی کنز الدقائق کی شرح ہے اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج ہی سبقتاً کسی استاد سے پڑھ لی ہوتی تو اس طرح کی غلط فہمی کا کبھی شکار نہ ہوتے۔

ایسے حضرات کی غلط فہمی ہم صرف ایک مثال دے کر رفع کرنا چاہیں گے، وگرنہ فقہ اسلامی تو اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے فقہاء انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کا کس قدر باریک بینی اور نزدیکی سے مشاہدہ کرنے والے لوگ تھے کہ بلا کسی خدائی مدد کے صرف انسانی کاوش کے زیر اثر ایسا کرنا ناممکن لگتا ہے۔ خیر ہم

مثال کی طرف آتے ہیں۔ زکوٰۃ کی بابت بات کرتے ہوئے مقدار نصاب کی بحث کے زیر اثر فقہاء نے ”زائد از ضرورت چیزوں“ کا بحث قائم کرتے ہوئے انسان کی بنیادی ضرورتوں پر بحث کی ہے کہ جن کی تکمیل کے بعد انسان کا مال زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچتا ہے۔ اس سے متعلق فقہاء نے ”انسان کی حقیقی ضرورتوں“ کی تعریف بیان کی ہے جو کہ زکوٰۃ کے باب میں سب سے بنیادی اہمیت کی بحث ہے اور جس کے تعین کے بعد ہی کسی انسان پر زکوٰۃ کے وجوب کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

فقہائے احناف نے ”حقیقی ضرورتوں“ کی بڑی جزر علمی تعبیر کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک انسان کی حقیقی ضرورت میں وہ اشیاء شامل ہیں جو کہ انسان کو ہلاک ہونے سے دور رکھیں، جیسا کہ غذا اور اس کا خرچ جس میں کھانے اور پینے دونوں کی اشیاء شامل ہیں، جائے سکونت یعنی مکان، اسلحہ، گرمی و سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے، ایسی چیزیں جن سے انسان تقدیر اپنی ہلاکت کو دور رکھ سکے یعنی اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں سے خود کو بچا سکے، اس کی سب سے بین مثال قرض ہے، جیسا کہ جو بقدر نصاب زکوٰۃ مال مقروض کے پاس ہے، مقروض پر واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بجائے اس مال کو قرض اتارنے کے لئے استعمال کرے کیونکہ اس مال سے قرض اتار کر وہ اپنے اوپر قرض نہ اتارنے کی صورت میں آنے والی کسی مصیبت جیسا کہ قید وغیرہ کو دور کر سکے کیونکہ قید ہو جانا آزاد انسان کے لئے ہلاکت کے درجے میں ہے۔ اسی طرح ان حقیقی ضرورتوں میں گھریلو استعمال کا سامان، پیشہ وارانہ آلات جو اس کو رزق کمانے میں مدد دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تعلیم یافتہ انسان کے لئے اس کی کتابیں بھی شامل ہیں، کیونکہ جہالت بھی انسان کے لئے ہلاکت کے درجے میں ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب دراہم (روپیہ یا مال) ہوں، جو وہ اپنی ان ضروریات پر خرچ کرنے کا محتاج ہو، تو زکوٰۃ میں دینے کے لئے یہ دراہم کا عدم شمار ہوں گے، جیسے کسی پیاسے شخص کے پاس پینے کا صرف اتنا ہی پانی ہو جس سے اس کی جان بچ سکتی ہو تو بلحاظ وضو پانی کو کا عدم تصور کیا جائے گا اور اس شخص کو تیمم کرنا جائز ہوگا۔ یہ ساری تفصیلات الدر المختار حاشیہ ابن عابدین اور البحر الرائق

کے جز ثانی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

یہ ہے ہمارے فقہاء کا بلند کردار و سوچ کہ ان کے نزدیک انسانی حریت اور علم ضروریات زندگی میں شامل ہیں کہ آزاد انسان کے لئے قید اور تعلیم یافتہ انسان کے لئے جہالت کو موت و ہلاکت قرار دیا ہے اور پھر آپ الزام لگاتے ہیں کہ ہمارے فقہاء نے انسانی ضروریات و حریت کا خیال نہیں کیا۔ جناب عالی! آج کسی ترقی پسند ملک میں بھی انسانی ضروریات کی بنیادی تعریف میں اس قدر باریک تفصیلات موجود نہیں جو کہ ہمارے فقہاء پچھلے ۱۳۰۰ سالوں سے بیان کرتے آرہے ہیں۔ اب جناب ”استاد محترم“ اس میں کون سے اضافے فرمانے لگے ہیں یہ تو ان کی جدید فقہ کے مدون ہو کر منظر عام پر آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ فی الحال ہمارا مشورہ ”استاد محترم“ کے تلامذہ کو یہی ہے کہ برائے مہربانی اپنے استاد کی محبت میں غلو کے پیش نظر ”روایت پرست“ فقہاء سے متعلق غلط پروپیگنڈہ سے پرہیز کیجئے اور کوشش کر کے کسی استاد سے سبقاً سبقاً کم از کم متقدمین فقہاء کی کتب کا مطالعہ کیجئے۔ ان شاء اللہ اس طرح کے لایعنی خیالات سے جلد افادہ ہوگا۔

ہمارے محدثین کا تفقہ فی الدین

اسی طرح ہمارے یہ مجددین دوست ہمارے محدثین پر بھی معترض ہوتے ہیں کہ محدثین جیسے امام بخاری وغیرہم پر محدثانہ رنگ کافی غالب تھا جس کی وجہ سے ان میں تفقہ کی کمی تھی۔ ایسے لغو اعتراضات پر انسان صرف اپنا سر ہی پیٹ کر رہ سکتا ہے۔ بھلا جس محدث کے لئے اہل علم کے ہاں ”فقہ البخاری فی تراجمہ“ کا جملہ معروف ہو اس کی بابت یہ خیال کرنا کہ اس میں تفقہ یا فقہ کی جزئی کی کمی تھی سخت لائق استعجاب بات ہے۔ جس کسی نے امام بخاری کی صحیح بخاری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو وہ یہ مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا کہ امام موصوف صرف ایک حافظ حدیث یا راوی حدیث نہ تھے بلکہ متون حدیث کی گہرائی میں اتر کر ان کے موتیوں کو اجاگر کرنے والے فقیہ بھی تھے۔ امام بخاری نے جس طرح اپنی صحیح میں تراجم ابواب قائم کئے ہیں

اس سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا امام بخاری نے صحیح حدیث کی کتاب کی تدوین کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ ان کا اصل ارادہ فقہی آراء پر مبنی ایک ایسی کتاب کی تالیف تھا جس میں فقہی احکام و عقائد میں اولہ کی بنیاد قرآن اور صرف صحیح حدیث پر رکھی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک ہی حدیث سے مختلف فقہی استنباط کا قرینہ موجود ہوتا ہے تو امام بخاری ایک ہی حدیث کو اپنی صحیح میں مختلف ابواب میں لے کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں بارہا ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ امام بخاری نے ایک باب کا عنوان باندھا اور اس کے ذیل میں کوئی حدیث ذکر نہ کی، غالباً یہ اشارہ اس جانب ہے کہ اس مضمون اور باب سے متعلقہ حدیث نبی ﷺ سے منقول تو ہے لیکن وہ میری کتاب کی شرط پر نہیں ہے، اس لئے وہ یہاں نہیں لائی جا رہی ہے، گویا اصل مقصد فقہی احکام کا استنباط ہے۔ اسی بات کو امام ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

”اتنی بات تو طے ہے کہ امام بخاری نے صحت کا التزام کیا ہے، مزید ان کے پیش نظریہ بات بھی ہے کہ وہ اس مجموعہ کو فقہی فوائد سے خالی نہ چھوڑیں اور حکیمانہ نکتوں سے بھی اسے مزین کر دیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی فہم سے متن حدیث میں سے کئی معانی کا استنباط فرمایا جنہیں کتاب کے متفرق ابواب میں مختلف مناسبت سے بطور عنوان ذکر کر دیا ہے، نیز ان آیات احکام کا بھی التزام کیا جن کا اس مسئلہ سے تعلق ہو اور آیتوں کی تفسیر کی جانب لطیف انداز سے اشارے بھی کر دیئے، یہی وجہ ہے کہ امام نے کئی ایک جگہ پر ترجمۃ الباب باندھا اور اس کے تحت کوئی آیت ذکر کر دی اور سند متصل سے کوئی حدیث نہ لاکر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا فیہ عن فلان عن النبی ﷺ اور کبھی بغیر سند کے متن کا ٹکڑا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔“ (ج ۱، ص ۸)

لختصر امام بخاری کا صحیح کی تالیف سے اصل مقصود صحیح احادیث کو اس طرح جمع کرنا تھا کہ فقہی احکام اور معنی کی نشاندہی ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری کا قاری بین طور پر محسوس

کر سکتا ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق ہیں۔ اسی لئے کسی مسئلہ میں ایک امام کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو کسی مسئلہ میں دوسرے امام کی رائے کو رائج قرار دیتے ہیں اور کبھی دونوں آراء پیش فرما کر کوئی تیسری رائے لاتے ہیں جو آئمہ میں سے کسی کی نہیں ہوتی بلکہ امام بخاری کی خود کی ہوتی ہے۔

پھر امام بخاری نے اپنی جامع الصحیح کو جس طرز پر تقسیم کیا ہے وہ نہ صرف ان کے تفقہ پر دلالت کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی اپنے اندر بہت دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام بخاری نے تمام کتب و ابواب کے درمیان ہم آہنگی و مناسبت کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ”بدء الوحی“ کی حدیث لائے ہیں جو کہ تمام تر شریعت اسلامی کی بنیاد ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ خاص کر یہ حدیث اپنے مکی استاد امام حمیدی سے لاتے ہیں گویا یہ بتلانا مقصود ہو کہ اسلام کی ابتداء وحی سے ہوتی ہے اور وحی کے اترنے کا پہلا مکان مکہ مکرمہ تھا سو میں بھی اپنی کتاب کو بدء الوحی سے شروع کر کے پہلی حدیث ایک مکی راوی سے لایا ہوں۔ اس کے بعد ”کتاب الایمان“ کا باب لاتے ہیں کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی طاعت قبول نہیں، اس کے بعد ”کتاب الصلوٰۃ“ لائے جو کہ ایمان کے بعد پہلا فرض عمل ہے، پھر ”کتاب الزکوٰۃ“ کیونکہ قرآن میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ساتھ ساتھ ذکر ہے۔ بعض نسخوں میں ”کتاب الجنائز“، کتاب الزکوٰۃ سے پہلے ہے کیونکہ جنازہ بھی صلوٰۃ سے ہی متعلق ہے۔ اس کے بعد صوم اور حج۔ عبادات سے فراغت کے بعد ان کتب کو ذکر کیا ہے جن کا تعلق معاملات سے ہے جیسے بیوع، سلم، اجارہ، ہبہ اور عتق وغیرہ۔ اس کے بعد ان کتب کو ذکر کیا ہے جن میں انسانوں کے درمیان تنازع کی نوبت آتی ہے اور اولی الامر سے مدد لیتی پڑتی ہے، چنانچہ کتاب الشہادت، صلح، وصیت، جہاد اور خمس کو ذکر فرمایا۔ پھر کچھ اور کتب ذکر کی ہیں جن کا تعلق فقہی مضامین سے نہیں جیسا کہ بدء الخلق، ابواب الجنۃ والنار، کتاب الانبیاء، کتاب علامات النبوة، مناقب قریش، فضائل صحابہؓ، اس کے بعد مغازی اور پھر تفسیر۔ ان ابواب سے فراغت کے بعد واپس فقہی مضامین کی طرف پلٹ کر نکاح، طلاق، نفقات کے ابواب قائم کرتے ہیں جن کی تکمیل کے بعد لوگوں کے شخصی معاملات کی طرف توجہ دیتے ہوئے اطعمہ، اشربہ، طب و مرضی، ادب، بروصلہ اور استغناء ان کے ابواب قائم فرماتے ہیں

اور مختلف احادیث کو ابواب و کتب کی مناسبت سے مکرر نقل کرتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد حقوق العباد سے متعلق ابواب لاتے ہیں جیسے کفارات، نذر و ایمان، حدود اور اکراہ، پھر کچھ ایسے ابواب لاتے ہیں جن کا تعلق فی الجملہ ایمانیات اور عقیدے سے ہے جیسے کہ کتاب تعبیر الرویا، فتن، احکام، الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ پھر کتاب الزہد والرفاق کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے آخر میں کتاب التوحید لے کر آتے ہیں جس میں عقائد اور کلامی مسائل کے متعلق کلام کیا گیا ہے گویا یہ بتانا مقصود ہو کہ ایک مومن کو اپنے اعمال کی فکر کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر بھی لگی رہنی چاہیے مبادا کسی کج روی کی بنیاد پر ایمان غارت ہو جائے اور سب کچھ دھرا رہ جائے۔

اس ہم آہنگی و مناسبت کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ اپنی جامع صحیح کی شروعات ”انما الاعمال بالنیات“ سے کرتے ہوئے اس کا اختتام ”کلمتان خفیعتان“ پر فرمایا ہے گویا یہ بتانا مقصود ہو کہ میں نے اپنے اس عمل کو خالص نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے انجام دیا ہے تاکہ روز محشر میرا یہ عمل میزان میں تل کر بھاری ثابت ہو۔

الحقیر امام بخاری کی پوری صحیح بخاری امام موصوف کے تفقہ فی الدین اور فقہ دانی پر شاہد ہے اور یہی وجہ رہی کہ کئی مسائل جیسے کہ فاتحہ خلف الامام اور رفع الیدین وغیرہ میں امام شافعی کی رائے کے موافق ہونے کے باوجود امام صاحب کئی مسائل میں ان سے اختلاف کر کے اپنی مجتہد مطلق کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہیں اور یقیناً جانے اگر امام بخاری کو امام محمد بن حسن شیبانی یا اسد بن فرات جیسے فقہ میں لائق شاگرد مل جاتے تو آج امام بخاری کی اپنی فقہ مروج ہوتی۔

حقیقت تو یہی ہے کہ متقدمین میں محمد نامی دو شخصیات ایسی ہیں جن کے تفقہ فی الدین پر اگر قسم کھالی جائے تو کبھی جھوٹی ثابت نہ ہو، ایک محمد بن اسمعیل المعروف امام بخاری اور دوسرے تلذذ امام مالک و امام ابوحنیفہ امام محمد بن حسن شیبانی۔ ہر چند کہ ان دو شخصیات کی فقہ ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف الخیال و مسائل ہیں لیکن امام بخاری کی صحیح کے ترجمہ ابواب اور امام محمد بن حسن شیبانی کی جملہ کتب کے مندرجات قاری کو سر دھننے پر مجبور کر دیتے

ہیں کہ کوئی فقہی مسائل و احکام کے استنباط میں اس قدر جزر و سر اور عبقری کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ ایک حدیث سو دفعہ پڑھ لیں، آپ اس سے دو سے زیادہ مسئلے نہ نکال پائیں گے اور اسی ایک حدیث کو امام بخاری اپنی صحیح میں پانچ مختلف جگہ لا کر پوری شد و مد سے پانچ مختلف مسائل پر استدلال کر جاتے ہیں۔ اسی طرح سے امام محمد کی المبسوط ہو یا السیر الکبیر و صغیر ہو، الاصل ہو یا الزيادات ہر کتاب امام صاحب کی فقہیت پر دلالت کرتی ہے۔ مسلم امہ بالعموم اور اہلحدیث و احناف بالخصوص ان دو شخصیات کے علمی احسانات کے بوجھ تلے رہتی دنیا تک دبے رہیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ اور تفقہ فی الدین

متجددین تو جو کام کرتے ہیں وہ اس بابت معذور و مجبور ہیں کہ ان کا اصل مقصد ہی اغلاف کو اسلاف سے برگشتہ کر کے اسلاف کے ذریعے وارد ہوئے اسلامی ذخیرے کو غیر معتبر ٹھہرانا ہے لیکن افسوس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب مسلکی تعصب کے زیر اثر اہلسنت سے تعلق رکھنے والے اصحاب ایک دوسرے کی مدوح شخصیات پر طعن کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ خود اس احقر کے ایک دوست معترض ہوئے کہ علم الحدیث سے اشتغال رکھنے کے باوجود آپ امام ابوحنیفہ کے اس قدر مداح کیوں ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ جناب جرح و تعدیل کے میدان میں کوئی ایسی شخصیت دکھا دیجئے جن پر جرح موجود نہ ہو، سو اگر امام ابوحنیفہ پر کچھ محدثین کی جرح ملتی ہے تو اس سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا انکار کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ امام محمد بن اسحاق بن یسار کو تو امام مالک جیسے محدث نے دجال و کذاب کہہ کر مجروح کیا، اس کے باوجود علماء کا ایک گروہ کثیران کی تعدیل کرتا نظر آتا ہے۔ تو پھر یہ اصول امام ابوحنیفہ پر تو بدرجہ اولیٰ لاگو ہونا چاہیے۔

دوست مزید معترض ہوئے کہ امام صاحب حدیث سے نابلد تھے، اس پر تو یہ احقر سر ہی پیٹ کر رہ گیا، بھلا دنیا میں مروج سب سے بڑی فقہ کا بانی جو کہ اتنی بڑی فقہ کی تدوین کا سامان کر گیا، وہ حدیث سے نابلد ہو سکتا ہے بھلا۔ انسان کا کام اس کی پہچان ہوتا ہے اور امام ابو حنیفہ کی فقہ ان کی حدیث دانی کا منہ بولتا ثبوت ہے، باقی سہو تو ہر امام سے ہوئے ہیں سو امام

ابوحنیفہ اس سے مبرا کیونکر ہو سکتے ہیں۔

امام شعبہ کے تفقہ فی الحدیث کا کون معترف نہ ہوگا، شعبہ کو امام ابوحنیفہ سے ایک خاص تعلق تھا، ان کی غیر حاضری میں اکثر ان کی ذہانت اور خوبی فہم کی تعریف کرتے تھے، امام ابوحنیفہ کی تعدیل میں ان کا یہ قول زبان زد عام رہ چکا ہے کہ، ”جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے، اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم امام ابوحنیفہ ہم نشین ہیں۔“

امام یحییٰ بن معین سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ آپ امام ابوحنیفہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں، ابن معین نے فرمایا کہ میرے لئے ابوحنیفہ کی تحسین کے لئے یہی بات کافی ہے کہ شعبہ نے انکو حدیث و روایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں۔ (عقود الجمان)

البتہ یہ بات درست ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ محدث کے طور پر مشہور نہ ہو سکے لیکن اس سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ امام صاحب حدیث میں کم مایہ تھے، سخت غلط استنباط ہوگا۔ چونکہ حدیث کی بہ نسبت فقہ میں امام صاحب کو کمال غالب تھا، سو ان کی مشہوری بھی اسی کے تحت ہوئی، خاص کر جب کہ امام ابوحنیفہ کی حدیث میں کوئی تصنیف بھی نہیں۔ لیکن اسی طور سے امام شافعی بھی محدث کے طور پر مشہور نہ ہو سکے بلکہ ان کی وجہ شہرت بھی فقہ ہی بنی تو کیا ان کے معاملے میں بھی حدیث میں کم مایہ ہونے کا الزام آئے گا۔ اصل بات یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ و امام شافعی بحیثیت فقیہہ زیادہ مشہور ہوئے، امام مالک بحیثیت فقیہہ و محدث جبکہ امام احمد بن حنبل محدث کے طور پر شہرت پائے، اب کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ امام احمد بن حنبل فقہ میں کم مایہ تھے تو شافعی و ابوحنیفہ احادیث سے نابلد تو ایسے صاحب کی تفقہ دانی پر سر ہی دھنا جاسکتا ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم نے امام صاحب سے کوئی روایت نہیں لی جب کہ امام صاحب کے تلامذہ سے کئی روایات لی ہیں جو کہ امام صاحب کے حدیث میں ضعیف ہونے پر دلالت کرتا ہے، تو ایسے اصحاب کی خدمت میں عرض ہے کہ امام بخاری و مسلم نے تو امام شافعی سے بھی کوئی روایت نہیں لی سو کیا اس قاعدے کی رو سے وہ بھی ضعیف ٹھہرائے جائیں گے۔

اگر امام ابوحنیفہ کے صرف تلامذہ کی فہرست پر ہی غور کر لیا جائے تو امام صاحب کے تفقہ فی الحدیث سے متعلق بہتر رائے قائم ہو سکتی ہے۔ عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی، عبداللہ بن مبارک، ابونعیم فضل بن دکین، یحییٰ بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل وغیرہم امام ابوحنیفہ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔

اب کوئی یہ پوچھے کہ کیا وجہ ہوئی کہ ائمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ پر محدثین کی جرح شدت سے ملتی ہے تو اس کی وجہ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کا اہل رائے کے لقب سے مشہور ہو جانا تھا، اور چونکہ محدثین کے ہاں رائے و قیاس کا استعمال مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا، اس وجہ سے اس لقب کی نسبت امام صاحب کے لئے بدگمانی کا باعث بنی۔ ہمارے اس خیال کو تقویت عبداللہ بن مبارک اور امام اوزاعی کے اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ امام عبداللہ بن مبارک امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کے لئے بیروت تشریف لے گئے۔ امام اوزاعی کو جب پتہ چلا کہ ابن مبارک کوفہ سے تشریف لائے ہیں تو برجستہ پوچھا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ کون شخص ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے؟ عبداللہ بن مبارک نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن بعد دوبارہ امام اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوئے کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے، امام اوزاعی نے وہ اجزاء ان کے ہاتھ سے لے لئے۔ ان اجزاء کے سرنامہ پر ”قال نعمان بن ثابت“ لکھا تھا، امام اوزاعی ان کو بغور پڑھتے گئے پھر عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ یہ نعمان بن ثابت کون شیخ ہیں؟ عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ عراق کے ایک شخص ہیں جن کی صحبت میں رہا ہوں، امام اوزاعی نے فرمایا کہ بڑے پائے کے عالم ہیں۔ عبداللہ بن مبارک نے عرض کیا کہ یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے، امام اوزاعی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنے قول سے یہ کہتے ہوئے رجوع کر لیا کہ بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی، جس کا میں افسوس کرتا ہوں۔ امام ابوحنیفہ سے ذاتی واقفیت کے بعد اس طور کی بدگمانی رفع ہونے کی مثالیں جناب باقر اور دوسرے اہل علم کے واقعات میں بھی ملتی ہے۔

الغرض ہمارے ناقص خیال میں جن جن محدثین و بزرگ حضرات کو امام صاحب کی

رفاقت و صحبت میسر رہی وہ امام صاحب کی جلالت قدری کے معترف رہے جن میں امام عبداللہ بن مبارک، امام اوزاعی، امام زفر، اور امام محمد بن حسن شیبانی جو کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے مشترک شاگرد تھے، بلکہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ امام مالک کی صحبت میں وقت گزارا تھا، وغیرہم شامل ہیں۔

رہی بات بعض محدثین کی امام ابوحنیفہ پر جرحیں تو اس طرح کی جرحیں اسماء الرجال کے علم میں عام ہیں، امام مالک کی جرح محمد بن اسحاق بن یسار پر، امام احمد بن حنبل کی جرح امام اوزاعی پر اور بعض محدثین کی جرحیں عکرمہ مولیٰ ابن عباس، محمد بن بشار بصری اور احمد بن صالح مصری پر، اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ایسی جرحیں قطعی شخصیت پر طعن کا ذریعہ نہیں بنتی۔

الحقیر امام ابوحنیفہ کا تفقہ فی الدین میں ایک اپنا مقام ہے۔ ان کی حدیث دانی کا انکار کرنا ناانصافی پر مبنی ہوگا، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم الحدیث میں اگر امام ابوحنیفہ کی بات امام احمد بن حنبل کے معارض آئے گی تو امام ابوحنیفہ کی بات رد کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل امیر المؤمنین فی الحدیث تھے، لیکن یاد رہے یہی اصول وہاں بھی لاگو ہوگا جہاں علم الفقہ میں امام احمد بن حنبل کی بات امام ابوحنیفہ کے معارض آئے گی کہ امام ابوحنیفہ کو فقہ میں وہی مقام حاصل ہے جو امام احمد بن حنبل کو حدیث میں۔

مسلمکی تعصب اور شخصیات: قاضی ابو یوسف، امیر ہارون الرشید اور زبیدہ خاتون

پچھلے دنوں ایک تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں کبار حنفی مجتہد و فقیہ قاضی ابو یوسف، امیر المؤمنین ہارون الرشید جیسے علم دوست خلیفہ اور زبیدہ خاتون جیسی عابدہ و زاہدہ خاتون کو فضول فقہی حیلوں میں مشغول باور کروانے کی مذموم سعی کی گئی۔ امام ابو یوسف جیسا عجمقری، امیر ہارون الرشید جیسا مخلص خلیفہ اور زبیدہ جیسی زاہدہ خاتون پر حیلہ بازی کی تہمت یوم قیامت پرش کا سبب بن سکتی ہے۔ امام ابو یوسف کچھ بھی نہ کرتے، صرف ایک کتاب الخراج ہی لکھ جاتے وہی ان کی علمی عظمت اور نام کو کافی ہوتا۔ زبیدہ خاتون کا زہد اور رفاه عامہ کے لئے ان

کے کام آج بھی تاریخ کی کتابوں میں ثبت ہیں جبکہ امیر ہارون الرشید جیسا علم الحدیث سے شغف رکھنے والا خلیفہ جو اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر بغداد سے مدینہ وارد ہوا کہ امام مالک سے ان کی موطا کا سامع کر سکے۔ خیر القرون کے ان اشخاص کی اس طرح کے بے اصل و بے سرو پا قصوں کے تحت کردار کشی غیر علمی طرز عمل ہے۔

ایسی لائیے اور بے اصل تحاریر کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ نجانے کب ہم میں سے مسلکی تعصب ختم ہوگا۔ ہماری اخلاقی حالت اس قدر گرگوں ہو چکی ہے کہ ہمارے مدرسہ کا وہ طالب علم جس نے درس نظامی کے چوتھے سال کی بھی ابھی تکمیل نہیں کی ہوتی، وہ پوری جرات و بیباکی سے امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، امام ابن الجوزی، امام ابن تیمیہ اور ابن خلدون وغیرہم پر اپنی زبان دراز کر رہا ہوتا ہے۔ اور پھر حد تو یہ ہے کہ علم الحدیث کی باریکیوں سے بے خبری کے سبب ان علماء پر محدثین کی جرحیں نقل کر کے فرماتے ہیں کہ دیکھو محدثین نے امام ابو یوسف کو حدیث میں ضعیف بتلایا ہے تو امام محمد بن حسن شیبانی کو لائق احتجاج قرار نہیں دیا۔ اوہ میرے بھائی! محدثین کا کسی راوی کو ضعیف ٹھہرانے کا مطلب اس کے کردار یا علمی قابلیت میں شک نہیں بلکہ اخذ حدیث میں اس سے روایت لینے میں از حد احتیاط کا تقاضہ ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا تھا کہ مدینہ میں کتنے اصحاب ایسے ہیں کہ اگر ان کے زہد پر قسم کھائی جائے تو جھوٹی نہ ہو لیکن میں ان سے روایت حدیث میں تردد کرتا ہوں۔

واللہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ اپنے مسلک کے برخلاف آپ امام ابو یوسف کو محدث اعظم مانیں یا امام محمد بن حسن شیبانی کو محدث کبیر مانیں لیکن کم از کم ان کو ان کا جائز حق تو دیجئے، ان کا فقہ میں جو مقام ہے، بین الاقوامی قوانین کی تشکیل میں جو کردار ہے، ایک عظیم فتہی ذخیرے کے اجراء اور تدوین میں جو کاوشیں ہیں انکا اعتراف تو کیجیے۔ آج فریق مخالف امام بخاری کو فقیہ ماننے سے انکار کر دے تو آپ کی دینی غیرت و مسلکی حمیت سے برداشت نہیں ہوتا تو پھر آپ کیونکر دوسرے فریق کے کبار علماء کی تنقیص میں مستعد نظر آتے ہیں۔ ایک مومن کے لینے اور دینے دونوں کے پیمانے ایک سے ہونے چاہئے۔ مجھے از حد یقین ہے کہ جو احباب امام

ابو یوسف یا امام محمد بن حسن شیبانی پر معترض ہوتے ہیں انہوں نے ان احباب کی کسی ایک کتاب کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ منہج محدثین کا پیروکار ہونے کے باوجود میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر ہمارے ایسے معترض احباب امام ابو یوسف کی صرف کتاب الخراج اور امام محمد بن حسن شیبانی کی صرف کتاب السیر کا مطالعہ کر جائیں تو ان کی فقہات و علمیت کے قائل ہوئے بنا نہ رہ سکیں گے۔

یہی کچھ عرض ہمارے ان دوستوں سے بھی ہے جو اپنا وقت امام بخاری کے عدم فقہت اور امام ابن تیمیہ کے شذوذ کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ امام بخاری کی فقہت کے لئے تو ان کی صحیح کے ترجمۃ الابواب ہی کافی ہیں، اس کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں پڑتی جبکہ امام ابن تیمیہ جیسے علماء کے بارے میں مستشرقین تک کہہ گئے کہ ایسے عمق و انسانیت کی تاریخ میں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

سو جناب! آپ احباب طابعلہم ہیں، سوطا لبعلم ہی رہیں، قاضی و مفتی نہ بنیں کہ فتویٰ صادر فرمائے جارہے ہیں۔ آپ اپنی پوری زندگی میں دین اسلام کی وہ خدمت نہیں کر سکتے جو یہ علماء اپنی صرف ایک کتاب سے کر گئے۔ سوان کو پڑھئے اور ان سے استفادہ کیجیے، نقد کا کام کبار علماء کے لئے رکھ چھوڑیئے۔

فقہی مذاہب اور خلفائے اسلام

وضعی روایات کے تحت عموماً یہ باور کروایا جاتا ہے کہ گویا پہلی صدی کے اختتام سے پہلے ہی عمال حکومت اور علمائے اسلام میں کافی بعد پیدا ہو چکا تھا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے دوری بنائے رکھتے تھے۔ جبکہ درست تاریخی حقائق اس بات کی کلیتاً نفی کرتے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ پر مشتمل پہلی مدون کتاب موطا امام مالک کی بابت صاف تصریح موجود ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصورؒ کے کہنے پر امام مالکؒ نے اس کی تدوین کا آغاز کیا تھا۔ حیات امام مالک ص ۴۳۲ میں علامہ ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں کہ: امام مالک کا موطا جمع کرنا

ابوجعفر المنصور عباسی کے کہنے پر مبنی تھا جس میں انہوں نے امام مالک سے درخواست کی تھی کہ حدیث کی ایک ایسی کتاب مدون کیجئے جس میں نہ تو عبداللہ بن عمرؓ کے شدائد ہوں، نہ عبداللہ بن مسعودؓ کے شدوذ اور نہ ہی عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتیں۔ اس میں اوسط امور اور وہ باتیں جس میں صحابہ کا اجماع ہے درج کیجئے۔ اس مشورے کی بابت ابن خلدون لکھتے ہیں کہ: امام مالک نے فرمایا: فواللہ لقد علمنی التصنيف یومئذ یعنی اللہ کی قسم (ابوجعفر المنصور نے) مجھے اسی وقت تصنیف کتاب کا طریقہ سمجھا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے موطا کی تدوین مکمل کر کے اپنی کتاب عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے سامنے پیش کی جس پر اس نے کتاب کی کافی تعریف کی اور تجویز سامنے رکھی کہ اس کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے تاکہ تمام بلاد اسلامیہ میں اس مجموعہ حدیث کے تحت فقہ اسلامی پر عمل کروایا جاسکے، جس پر امام مالک نے علمی توسع کے پیش نظر ہارون الرشید کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔

پھر یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اس کتاب کو پوری بلاد اسلامیہ کا فقہی ماخذ بنانے کی بات کرتے ہیں جس میں امام مالکؒ نے سیدنا معاویہؓ، سیدنا مروانؓ اور امیر عبدالملک بن مروانؓ جیسے اموی اساطین کے فتاویٰ اور تعامل درج کئے ہیں۔ گویا سیاسی اختلاف اپنی جگہ لیکن علمی طور پر بنو امیہ اور بنو عباس میں کوئی باہمی تعصب نہیں تھا کیونکہ دونوں ہی قرآن و سنت کو دین کا ماخذ ماننے کے دعویدار تھے۔ پھر چار عباسی خلفاء نے خود امام مالک سے موطا امام مالک کی سماعت کی یعنی امیر مہدی عباسی، امیر ہارون الرشید عباسی، امیر محمد الامین عباسی اور امیر عبداللہ المامون عباسی۔ علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء ص ۴۹۳ میں لکھتے ہیں کہ:

”قاضی فاضل نے ایک رسالے میں کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی بادشاہ نے طلب علم کے لئے سفر کیا ہو سوائے ہارون الرشید کے۔ وہ اپنے دونوں فرزندوں الامین اور المامون کے ساتھ موطا کی سماعت کے لئے امام مالک کے پاس گیا۔ پھر کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے جس نسخے سے سماعت کی وہ مصریوں کے خزانے میں محفوظ تھا، پھر کہتے ہیں کہ اس کی سماعت کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی

نے اسکندریہ کا سفر کیا اور طاہر بن عوف سے اسکی سماعت کی۔ ایسے کسی تیسرے کو میں نہیں جانتا۔“

جس موطا کی تدوین و اشاعت عباسی دور حکومت میں ہوئی اس موطا میں امام مالک نے کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا اموی خلیفہ عبدالملک کے طرز عمل کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل علم نے عبدالملک بن مروان کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالک نے عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو سنت کی دلیل قرار دیا۔ امیر عبدالملک بن مروان سیرت سے متعلق معلومات کے لئے اکثر و بیشتر عروہ بن زبیرؓ کو سوالات بھیجا کرتے تھے اور عروہ ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ عبدالملک کے خطوط اور عروہ کے جوابات آج بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالات و جوابات امام طبری نے اپنی تاریخ میں مکمل سند کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ واقدی، ابن سعد اور دوسرے مورخین کے ہاں بھی عبدالملک اور عروہ کے یہ سوالات و جوابات مل جاتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عروہ بن زبیرؓ کے بھائی سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ امیر عبدالملک بن مروان کے ساتھ حکومتی کشمکش کے نتیجے میں شہید ہوئے تھے، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان سیاسی اختلاف کو نہ عبدالملک بن مروان نے کبھی علم کی جستجو میں آڑے آنے دیا اور نہ عروہ بن زبیرؓ نے ان کو بنیاد بنا کر کتمانِ علم کیا۔

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے مغازی عروہ بن زبیر کو تلاش و بسیرا کے بعد تحقیق کر کے ایک کتابی شکل میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں عبدالملک اور عروہ کے یہ سوالات و جوابات من و عن اسی طور سے موجود ہیں جیسا کہ طبری اور ابن سعد وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغازی عروہ بن زبیر جو کہ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے منصفہ شہود پر دوبارہ آسکی، بشرط صحت، سیرت کی سب سے اوّل موجود کتاب ہے۔

اسی طرح جب یحییٰ مہمودی موطا امام مالک کو لے کر مغرب گئے تو وہاں اموی حکومت کی سرپرستی میں موطا کو مقبولیت نصیب ہوئی اور یوں مالکی فقہ ان علاقوں کا دستور قرار

پایا۔ گویا مشرق کے عباسی ہوں یا مغرب کے اموی، سب سیاسی اختلافات کے باوجود ایک دین کے پابند تھے۔ جس طرح عباسیوں نے موطا میں سیدنا مروان اور امیر عبدالملک بن مروان کے فتاویٰ کو دین کی بابت حجت باور کیا، اسی طرح مغرب کے اموی امراء نے بھی اس کا خیال نہیں کیا کہ موطا کی تدوین عباسیوں کی زیر پرستی اور تجویز کے تحت ہوئی ہے۔ اسی طرح سے امام شافعی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الام کی ج ۴، ص ۱۵۸ میں دیوان فاروقی کے سلسلے میں امیر المومنین سیدنا معاویہؓ کے ساتھ ساتھ عباسی خلیفہ المہدی عباسی کا تعامل بھی بطور نظیر شرعی درج فرمایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد کبیر جناب امام ابو یوسف کو خلافت عباسیہ میں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کس سے مخفی ہے کہ دولت اسلامیہ کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے۔ بقول علامہ ابو زہرہ مصری کہ خلافت عباسیہ کا استحکام بھی ایک سبب تھا فقہ حنفی کی اشاعت اور فروغ میں۔ (حیات ابوحنیفہ للمولف ابو زہرہ مصری)

بعینہ اسی طور سے امام شافعی اور امام احمد کے مذاہب کو بھی مکمل فروغ اس وقت حاصل ہوا جب کہ عباسی خلفاء نے ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ امیر القادر باللہ عباسی فقہ شافعی کے ائمہ میں سے تھے اور ساتھ ہی ایک اور عباسی خلیفہ امیر المسترشد باللہ جو کہ عمدة الدین ابو الدین کہلاتے تھے وہ بھی فقہ شافعی کے پیروکار تھے اور ان کے اسی لقب کی مناسبت سے امام ابو بکر الشاشی نے اپنی کتاب العمدۃ تحریر کی تھی۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ، ج ۴، ص ۲۹۱)۔ امام شافعی اور امیر ہارون الرشید عباسی کے کافی قریبی تعلقات کا مورخین و فقہاء نے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید امام مالک کے ساتھ ساتھ امام شافعی کا بھی کافی معتقد تھا۔ اسی طرح سے مامون اور مابعد کے معتزلی عباسیوں کے ظلم کے بعد جب متبع سنت عباسی خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ عباسی برسر اقتدار آیا تو نہ صرف اس نے امام احمد کو خلق قرآن کے مسئلہ کی بابت صعوبتوں سے مکمل نجات دلوائی بلکہ ان کا مخلص معتقد رہا۔ یہی وجہ رہی کہ مابعد کے ادوار میں آنے والے عباسی خلیفہ امیر الناصر الدین باللہ اور امیر المستضی باللہ نے حنبلی مذہب اختیار کر کے اپنے عہد حکومت میں اس کی اشاعت کی۔ الغرض ایسا قطعی نہیں تھا کہ خلفائے اسلام اور

علمائے اسلام میں کوئی مشرق و مغرب کا بعد تھا بلکہ ہمارے اکثر خلفاء و عمال امور دین کے ماہر بھی ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم جب سندھ فتح کرنے آئے تو اس وقت علوم الاسلامیہ کی کافی شد بدرکھتے تھے اور جس حجاج بن یوسف نے انہیں سندھ فتح کرنے بھیجا اس کی قرآن فہمی اور ذوق قرآنی سے کس کو مجال انکار کہ قرآن کی رکوعوں میں تقسیم اور ان پر حرکات لگوانے کا کام حجاج نے ہی کروایا تھا۔ اسی طرح الجوہر المصنیہ فی طبقات الحنفیہ میں یہ تصریح ہے کہ سلطان محمود غزنوی فقہ میں کافی درک رکھتے تھے اور کئی فقہی مسائل کی تنقیح ان سے ثابت ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تھا جنہوں نے طاہر بن عوف سے موطا کی سماعت کے لئے اسکندریہ کا سفر کیا۔ المختصر اسلامی تاریخ کے بیشتر خلفاء و امراء اور سلاطین عام طور پر اصحاب علم و فضل تھے جن کی زندگی علم سیاست کے ساتھ ساتھ علم دوستی میں بھی صرف ہوئی۔

امام ابوحنیفہؒ اور زید بن علی کا خروج

تاہم بعض خلفاء اور علمائے وقت کے مابین اختلافات اور باہمی نزاعات کے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے ہمیں مجال انکار نہیں، تاہم ایسے واقعات کافی کم ہیں اور چند علماء تک ہی محدود ہیں۔ جیسے امام احمد بن حنبل اور معتزلی خلیفہ مامون عباسی کا اختلاف جس کی پاداش میں امام احمد بن حنبل کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے کئی واقعات جھوٹے راویوں نے گھڑ کر ان جلیل القدر ائمہ کے سر منڈھ دیئے ہیں۔ جس میں سے ایک مشہور واقعہ حکومتِ وقت کے خلاف کی گئی بغاوتوں کو امام ابوحنیفہ کی تائید حاصل ہونا ہے۔ ابو بکر بھصام جو کہ اپنے معتزلی اور شیعہ نظریات کے لئے معروف ہیں، نے اپنی تفسیر کی ج اول، ص ۸۱ پر دعویٰ کیا ہے کہ زید بن علی بن حسین نے جب ۱۲۲ ہجری میں ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کیا تو امام ابوحنیفہ کی پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی، انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی (احکام القرآن، ج ۱، ص ۸۱)

مقامِ حیرت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے صرف مالی مدد اور تلقین پر ہی کیوں اکتفاء کیا،

پورے طریقے سے مسلح جہاد کیوں نہ کیا حکومتِ وقت کے خلاف زید بن علی کے ساتھ مل کر۔ یہاں تک کہ سید مودودی نے تو خلافت و ملوکیت میں یہاں تک لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کو جنگِ بدر میں نبی ﷺ کے خروج سے تشبیہ دی۔ شاید سید مودودی کو خود بھی یہ احساس ہوا ہو کہ ایسا خروج جو جنگِ بدر سے مماثل ہو، اس میں مسلح شرکت نہ کرنے کی بناء پر لوگ امام ابوحنیفہؒ کی طرف اس تائید کی نسبت کو وضعی و غیر ثابت باور کر سکتے ہیں سو انہوں نے آگے یہ خود بیان کر دیا کہ جب زید کا پیغام امام ابوحنیفہؒ کے نام آیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو انہوں نے قاصد سے کہا کہ اگر میں جانتا کہ لوگ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے اور سچے دل سے ان کی حمایت میں کھڑے ہوں گے تو میں ضرور ان کے ساتھ ہوتا اور جہاد کرتا کیونکہ وہ امامِ حق ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسی طرح زید سے بے وفائی کریں گے جس طرح ان کے دادا (سیدنا حسینؑ) سے کر چکے ہیں، البتہ میں روپے سے ان کی مدد کروں گا۔ (بحوالہ المکی، ج ۱، ص ۲۶۰)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی جانب اس خروج کی حمایت کی نسبت ہی سخت غیر معتبر ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النعمان میں اس واقعہ کو من گھڑت قرار دیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز صاحب بھی تحفۃ الثنا عشریہ میں اس حکایت کو غیر صحیح اور خلاف واقعہ قرار دیتے ہیں۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

”جس قدر تاریخی اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ زید بن علی نے ۱۲۱ ہجری میں بغاوت کی تھی، اس وقت ہشام بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن تھا۔ ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزر س تھا لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و سکون کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں، اس حالت میں امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔“ (سیرۃ النعمان، ص ۲۰)

ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور اور اس روایت کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ ائمہ احناف بشمول امام ابوحنیفہ بلکہ جمہور ائمہ مجتہدین کا مسلک اس روایت کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک جو قواتر کے ساتھ ان سے منقول ہے اور جو صرف ان کا نہیں بلکہ ائمہ اربعہ اور جملہ مجتہدین فقہاء و محدثین علماء اہلسنت کا مسلک ہے عقیدۃ الطحاویہ میں اس طرح مذکور ہے:

ولا نرى الخروج على ائمتنا و ولاية امورنا و ان جارود اولاندعوا
عليهم ولا ننزع يد ائمتنا من طاعتهم من طاعة الله فريضة مالم يامروا
بمعصية و ندعولهم بالصلاح و المعافاة (ص ۵۰)

یعنی ”اور ہم اپنے ائمہ (سربراہانِ مملکت) اور حکام کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظلم کریں اور ہم انہیں بددعا دینا (بھی جائز نہیں سمجھتے) اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا بھی جائز نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے تقاضے سے ہم ان کی اطاعت کو اس وقت تک فرض سمجھتے ہیں جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں اور ہم ان کے لئے صلاح اور معافاة کی دعا کرتے ہیں۔“

یہ ہے امام ابوحنیفہ اور جمہور اہلسنت کا مسلک جو قواتر کے ساتھ ان سے منقول اور کتب فقہ و عقائد میں مسطور ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور و معتبر کتاب رد المحتار المعروف بہ شامی باب البغاة میں علامہ ابن عابدین شامی مسلک احناف نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

و اذا ولى عدلاً ثم جار و فسق لا ينعزل و لكن يستحق العزل ان لم
يستلزم فتنة

یعنی ”اگر کسی عادل کو خلیفہ بنایا گیا پھر وہ ظلم و فسق کا مرتکب ہوا تو معزول نہیں ہو جاتا لیکن عزل کا مستحق ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کا معزول کرنا کسی فتنہ کا سبب نہ بنے۔“

اسی طرح الفقہ اکبر عقائد کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کے بارے میں مشہور

تو یہ ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کی تصنیف ہے لیکن بعض اہل علم بشمول علامہ شبلی نعمانی نے اس کا انکار کیا ہے تاہم یہ بات متفق علیہ ہے کہ یہ عقائد اہلسنت خصوصاً ماتریدیہ و احناف کے عقائد کی معتبر ترین کتاب ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ مجتہدین کے مسلمہ عقائد و نظریات بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں مذکور ہے:

و يجوز الصلوة خلف كل بر وفاجر

یعنی ”صالح اور فاجر دونوں کی اقتداء میں صلوٰۃ جائز ہے۔“

گویا جب فاجر کی اقتداء میں صلوٰۃ جائز ہے تو بدرجہ اولیٰ اس کی امارت بھی جائز ہوگی، وہ الگ بات ہے کہ مومن اس سے کراہت کریں۔

پھر عجیب تر بات یہ کہ زید بن علی نے امام ابوحنیفہ کے پاس قاصد بھیج کر ان کو خروج میں اپنی تائید کرنے کو کہا جب کہ یہ بات معروف ہے کہ زید بن علی کے خروج کے وقت تک امام ابوحنیفہ کو فقیہ اہل مشرق ہونے کا مرتبہ اور اثر و رسوخ حاصل نہ ہوا تھا اور ۱۲۰ ہجری میں جس وقت زید اپنے خروج کی تیاریاں شروع کر رہے تھے اس وقت امام ابوحنیفہ کی حیثیت امام حماد کے ایک شاگرد کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ زید بن علی نے امام حماد کو چھوڑ کر ان کے شاگرد کو خروج میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ زید بن علی فقیہ اہل مشرق امام حماد کو قاصد بھیج کر خود کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دیتے۔ لیکن اس روایت کو وضع کرنے والے راویوں کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہ آئی اور انہوں نے امام حماد کی جگہ امام ابوحنیفہ کا نام لے لیا وہ بھی ایسے وقت میں جب امام صاحب کو نہ فقیہ اہل مشرق ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا تھا اور نہ ان کا کوئی اثر و رسوخ تھا۔ پھر اگر واقعی ایسا ہوا بھی ہوتا تو امام ابوحنیفہ جب کہ ابھی امت میں ان کو وہ مقام حاصل نہ ہوا تھا جو بعد میں ان کو مل سکا تو زید کے خروج کی حمایت میں ان کی رائے کس کام کی ہوتی۔ پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ امام صاحب خلیفہ وقت کے خلاف خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ سلطان ابوالمظفر عیسیٰ بن ایوب الملک امام ابوحنیفہ کا اس متعلق امام ابوحنیفہ کا مسلک و مذہب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

لا نرى الخروج على ائمتنا و ولاية امورنا ان جارودا علينا (الاسم المصيب في الرد على الخطيب، ص ۴۷)

یعنی ”ہم اپنے ائمہ اور حاکموں کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ہم پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔“

اس کے بعد سلطان ابوالمظفر فرماتے ہیں: فمن يكون هذا رايه كيف يرى الخروج على الائمة یعنی جس شخص کا نظریہ یہ ہوگا وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کب جائز سمجھے گا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب مواقف صحابہ پر مبنی تھا جس کی تعلیم آپ نے صحابہ اور امت کو دی تھی۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ کی روایت ہے:

حدثنا احمد بن عبد الرحمن بن وهب بن مسلم، حدثنا عمي عبد الله بن وهب، حدثنا عمرو بن العارث، حدثني بكيز، عن بسر بن سعيد، عن جنادة بن ابى امية، قال: دخلنا على عباد بن الصامت وهو مريض، فلقلنا: حدثنا اضلعك الله، بعدئذ ينفع الله به سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: دعانا رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعناه، فكان فيما اخذ علينا: ان بايعنا على الشمع والطاعة في منشطنا في، مكرهنا، وغسرننا ويسرننا، واثرة علينا، وان ننازع الامر اهله، قال: الا ان تروا كفرة ابوا احاندكم من الله فيه برهان.

”جنادہ بن ابی امیہ سے روایت ہے، کہا: ہم عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، وہ (اس وقت) بیمار تھے، ہم نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے، ہم کو ایسی حدیث سنائیے جس سے ہمیں فائدہ ہو اور جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو، (سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے) کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بلایا، اور ہم سے بیعت لی۔ آپ ﷺ نے جن امور پر بیعت لی وہ یہ تھے کہ ہم حکام کا حکم سنیں اور اطاعت کریں خواہ ہمیں پسند ہو یا نہ

ہو، اس سے تنگی ہوتی ہو یا فراخی یا ہمیں ایثار سے کام لینا پڑے اور یہ کہ ہم حاکموں سے نزاع نہ کریں سوائے اس کے کہ تم ایسا کفر بواح دیکھو (جس سے خون حلال ہو جاتا ہے) اور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس اس بارے میں حجت ہو۔ (صحیح مسلم، کتاب الامار، حدیث ۴۸۸۱)

اسی طرح سیدنا واکل بن حجر سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزیدؒ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

یا نبی اللہ! رایت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقہم و یمنعونا حقنا فماتنا مرنا؟ قال اسمعوا و اطیعوا و انما علیہم ما حملوا و علیکم ما حملتم (مسلم۔ کتاب الامارۃ)

”اے اللہ کے نبی ﷺ! اگر ہم پر ایسے امیر مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق تو مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ایسی صورت میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: ”ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ ان کی ذمہ داری کا وبال ان پر ہے اور تمہاری ذمہ داری (سمع و اطاعت) کا تم پر۔“

نیز فرمایا:

من رای من امیرہ شیاً یکرہہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعة شبراً فیموت الامات میتة جاہلیہ (متفق علیہ) (بخاری، کتاب الاحکام)

”جو شخص اپنے امیر میں ناپسندیدہ فعل دیکھے تو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو کوئی جماعت سے باشت بھر بھی جدا ہوا اور مرجائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی ہریرہ عن نبی ﷺ قال: من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فمات مات میتة جاہلیہ و من قاتل تحت رایة عمیة بغضب العصبیة او یدعو الی عصبیة او ینصر عصبۃ فقتل فقتلۃ

جاهلیہ (مسلم، کتاب الامارۃ)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص امیر کی اطاعت سے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا۔ پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا اور جو شخص کسی اندھے (نشان) کے تحت لڑائی کرے۔ عصیت کے لئے غصہ دلائے یا عصیت کے لئے بلائے یا عصیت کے لئے مدد کرے پھر قتل کیا جائے تو وہ بھی جاہلیت کی موت مرا۔“

ان تمام روایات کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف زید بن علی کے خروج میں ان کی حمایت کر کے معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوتے۔ پھر مقام حیرت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے منہ سے زید بن علی کے خروج کو جنگ بدر کے مماثل قرار دیا جا رہا ہے۔ استغفر اللہ۔ جناب زید بن علی کی اس بغاوت کو جس کو شرعاً کسی طور سے جائز نہیں کہا جاسکتا جو کہ مسلمانوں کے اس وقت کے متفق علیہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف برپا کی گئی اور جس کا مقصد صرف حصول اقتدار کے سوا اور کچھ نہ تھا، غزوہ بدر سے تشبیہ دینا جس کا واحد مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا جو کافروں کے مقابلے میں تھا، جہاد فی سبیل اللہ کی توہین اور شریعت اسلامیہ کی تضحیک ہے۔ اس تشبیہ کا دوسرا مکروہ پہلو یہ ہے کہ جس مبارک جنگ کے شرکاء امت کے افضل ترین افراد اور اللہ تعالیٰ کے وہ عباد مخلصین تھے جن کا مقبول عند اللہ ہونا قطعی و یقینی ہو اور جس جنگ کے سپہ سالار افضل الخلائق سید الانبیاء نبی ﷺ ہوں، اس کی برابری کوئی جنگ نہیں کر سکتی۔ جناب زید بن علی کے خروج کو اس کے برابر و مشابہ قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے جس کا تصور بھی امام ابوحنیفہ جیسی ذی علم و متقی شخصیت سے کرنا محال ہے۔ اگر ہم زید بن علی کو ولی کامل بھی تسلیم کر لیں تو بھی ان کے ایسے سینکڑوں مل کر بھی کسی ادنیٰ صحابی کی خاک پاء کی برابری نہیں کر سکتے چہ جائیکہ ان کے خروج کو اس جنگ سے تشبیہ دینا جس میں نبی ﷺ بنفس نفیس شریک ہوں اور امت کی افضل ترین جماعت یعنی جماعت صحابہ رضوان اللہ اجمعین شامل جہاد ہو۔ یہ صرف صحابہ کرامؓ کی شان میں نہیں بلکہ خود نبی ﷺ کی شان میں

بھی صریح گستاخی اور توہین ہے۔ امام ابوحنیفہ اس شنیع قول سے قطعی بری ہیں اور ان کی جانب اس قول کی نسبت ان پر افتراء و بہتان ہے۔ اور اگر یہ قول امام ابوحنیفہ سے درست ثابت ہو تو خود امام صاحب کی وثاقت و مرتبہ کو صفر کرنے کو کافی ہے۔ اگر نعوذ باللہ من ذالک امام ابوحنیفہ نے زید بن علی کے خروج کو غزوہ بدر کا مماثل سمجھا تھا اور وہ انہیں امام حق سمجھتے تھے تو دو باتوں میں سے ایک بات انہیں کرنی چاہیے تھی۔ یا تو زید کا ساتھ دے کر بزعم خویش سیدنا ابو بکرؓ و عمرؓ کی سی فضیلت حاصل کر لیتے یا انہیں سمجھاتے کہ اوّل وسائل مہیا کریں، رائے عامہ کی حمایت حاصل کریں اور مناسب وقت کا انتظار کر کے خروج کریں جب کامیابی یقینی نظر آئے۔ ان دونوں باتوں میں سے امام صاحب نے کسی بھی بات پر عمل نہ کیا تو یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو زید کا ساتھ دینے کی تلقین کرتے تھے اور روپے سے زید کی مدد کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ اور ائمہ شیعہ کی شاگردی

پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا گیا کہ اہلسنت کی سب سے بڑی مروجہ فقہ یعنی فقہ حنفی اہل تشیع کے اماموں کی شاگردی کا شاخسانہ ہے کیونکہ فقہ حنفی کے بانی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اکتساب علم جناب محمد الباقرؑ، ان کے فرزند جناب جعفر الصادقؑ اور جناب زید بن علی بن الحسین سے کیا ہے۔ یہ ایک ایسی لغو بیانی ہے جس کی تائید کسی صحیح السند تاریخی روایت سے نہیں ہوتی۔ کتب اسماء والرجال میں امام ابوحنیفہ کے اصل شیوخ میں کہیں بھی ان حضرات کا نام نہیں آتا۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اس بابت منہاج السنہ، ج ۴، ص ۱۴۳ میں لکھتے ہیں:

”یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم کا آدمی بھی جانتا ہے، کیونکہ ابوحنیفہ تو جعفر صادق کے ہم طبقہ ہیں۔ جناب جعفر الصادق کی وفات ۱۴۸ ہجری کی ہے جبکہ امام ابوحنیفہ نے ۱۵۰ ہجری میں وفات پائی۔ ابوحنیفہ تو صادق کے والد ابو جعفر محمد الباقر کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ امام ابوحنیفہ

نے جعفر الصادق یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو، بلکہ انہوں نے علم ان بزرگوں سے حاصل کیا جو ان دونوں سے زیادہ معمر تھے جیسے عطاء بن ابی رباح اور ان کے اصل استاد حماد بن ابی سلیمان۔“

پھر بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اساتذہ کا علمی و فقہی معیار کافی بلند تھا جبکہ جناب جعفر الصادق کا نام دور خیر القرون میں بعض احادیث کی روایت میں تو ملتا ہے لیکن ان کی فقہ کا کوئی وجود اس زمانے میں نظر نہیں آتا، اسی لئے جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب بویہ کی شیعہ حکومت نے پر پرزے نکالے اور اس وقت چند اختراعی و وضعی قوانین کو جناب جعفر کی طرف منسوب کر کے فقہ کے نام پر رواج دیا جانے لگا۔ اس سے پہلے جناب جعفر کا نام نہ تو کسی فقیہ کے طور پر ملتا ہے اور نہ ہی ان کی فقہ کا کوئی محدث و فقیہ ذکر کرتا ہے۔ اسی بات کو امام ابن حزم اپنی کتاب الملل و النحل، ج ۳، ص ۳۹ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

”سیدنا ابن عباس رض نے اپنی فقہ بیس کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش کیا جائے تو ان کی احادیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہنچے گی، حالانکہ حسن و حسینؑ کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔ یہی حال جناب علی بن حسین بن علی کا بھی ہے۔ محمد بن علی (الباقر) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جز تک پہنچتی ہے اور اسی طرح جناب جعفر الصادق کی بھی۔ حالانکہ روافض کا دعویٰ یہ ہے کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔ جعفر الصادق کے بعد تو ہمیں ان آئمہ کے علم کا بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ نہ حدیث میں، نہ فقہ میں، باوجودیکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے زمانے کے قریب ہے۔“

الغرض امام ابوحنیفہ کا سارا کتب علم جلیل القدر اصحاب رسول ﷺ کے تلامذہ سے تھا جیسے عطاء بن ابی رباح جو کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے تلمیذ تھے جبکہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا علم امام صاحب نے امام حماد بن ابی سلیمان سے حاصل کیا تھا، سو امام صاحب کو ہم عصر علوی

حضرات سے اکتساب علم کی قطعی حاجت نہ تھی اور نہ ہی ان کو اس کا موقع ملا، کیونکہ امام صاحب کی بیشتر زندگی کوفہ میں گزری جبکہ مقدم الذکر علوی حضرات کا قیام مدینہ میں رہا جہاں امام صاحب کا آنا صرف حج کے مواقع پر ہی ہوتا تھا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ امام ابوحنیفہؒ کی جناب محمد الباقریا جناب جعفر الصادق سے ملاقاتیں ہی نہ رہی ہوں گی، قرین قیاس ہے کہ ان اصحاب سے امام ابوحنیفہؒ کی صحبتیں رہی ہوں، علمی مذاکرات بھی ہوئے ہوں کہ جب امام صاحب زیارت مسجد نبوی ﷺ کی غرض سے مدینہ آتے ہوں تو ان اصحاب سے ملتے ہوں۔ یقیناً ایک دوسرے کی تکریم بھی ہوتی ہوگی جو کہ اہل علم کا شعار ہے، لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے کہ امام صاحب نے اپنے ان ہم عصر حضرات سے اخذ علم کیا اور اس تعلق سے امام ابوحنیفہؒ کی پوری فقہ دنیائے شیعیت سے مستعار لی گئی ہے۔

پھر امام مالک جو کہ سوائے حج کے ساری زندگی مدینہ سے باہر نہ نکلے، اور جن کی شائد روزانہ ہی جناب جعفر الصادق سے ملاقات بھی ہوتی ہوگی لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ موطا امام مالک میں جناب جعفر الصادق سے صرف چند ہی روایات آتی ہیں، جبکہ اسی جگہ سیدنا مروانؒ اور ان کے لائق و عالم فرزند عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی مرویات و فتاویٰ کثرت سے موطا میں پائے جاتے ہیں۔ گویا جب مدینہ میں رہتے ہوئے جناب جعفر الصادق کے علم کا کوئی خاص اثر امام مالک کی فقہ پر نہیں پڑ سکا تو کوفہ میں موجود امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کو جناب جعفر الصادق کے علم کا مرہون منت گردانا چہ معنی دارد۔

خود اہل تشیع کے معتبر عالم قاضی نور اللہ شوستری جن کو شیعہ ”شہید ثالث“ کا لقب دیتے ہیں اپنی کتاب مجالس المؤمنین میں اعتراف کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کو اکتساب علم میں جناب جعفر الصادق سے کوئی ”خاص فیض“ حاصل نہ ہو سکا:

”امام جعفر الصادق سے ابوحنیفہؒ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرات سے کچھ حدیثیں سنی تھیں، چونکہ وہ حضرات ان (یعنی ابوحنیفہؒ) کو مردودوں میں سے سمجھتے تھے۔ ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر انخفاء کرتے۔“

المختصر نہ ہی تو کسب علم میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے جناب جعفر الصادق رحمہ اللہ کی کوئی ایسی علمی فضیلت تھی کہ امام ابوحنیفہ ان سے علم حاصل کرتے اور نہ ہی ان کو اس کا موقع ملا سو یہ کہنا سراسر بے جا اور خلافت حقیقت بات ہے کہ فقہ حنفی جیسی وسیع اور سب سے بڑی و عمیقی فقہ جو کہ دوسری ہجری کے اواخر تک مدون ہو چکی تھی، اس فقہ سے مستعار لی گئی ہے جس کی تدوین ہی وضعی طور پر چوتھی صدی ہجری میں ایک شیعہ حکومت آل بویہ کی سرپرستی میں جناب جعفر الصادق کی طرف غلط طور پر منسوب کر کے کی گئی تھی۔

امام ابوحنیفہ اور شیعیت

اس کے بعد کچھ منجملوں کی طبیعت نے زیادہ شوخی دکھائی تو انہوں نے امام ابوحنیفہ کی بابت یہ گوہر افشانی فرمائی کہ امام ابوحنیفہ کا ذہنی میلان تشیع کی جانب تھا اور ان کی ساری فقہی موشگافیاں جناب جعفر صادق کی تربیت اور علوم کے مہون منت تھیں۔ جہاں تک امام ابوحنیفہ کے جناب جعفر صادق سے علم الفقہ سیکھنے کی بات ہے تو اس دعویٰ کا ابطال ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اب جہاں تک رہی یہ بات کہ امام ابوحنیفہ کا میلان شیعیت کی طرف تھا تو اس دعویٰ پر افسوس سے زیادہ حیرانی ہی دکھائی جاسکتی ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ علمائے حدیث میں بعض حضرات کے نزدیک اہل ہوا و بدعت سے اخذ روایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک ان علماء میں شامل ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی پائی جاتی ہے اور خصوصیت سے یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیع پایا جاتا ہو کیونکہ تشیع سے آدمی جنگ جمل و صفین میں فریق بن جاتا ہے اور ان واقعات کو غیر معمولی اہمیت دے کر صحابہ کرامؓ کی جناب میں سوء ظن کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ شیعہ تصورات رکھنے والوں سے اس قدر زیادہ بیزار تھے کہ ان کی روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ چنانچہ علامہ خطیب بغدادی نے الکفایہ فی علم الروایۃ میں اپنی سند سے امام ابوحنیفہ کے شاگرد خاص عبداللہ بن

مبارک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ابوعمصہ نے امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا حکم فرماتے ہیں، امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ ہر معتبر ثقہ شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں جماعت سے ہٹا ہوا ہو، سوائے شیعہ کے۔ پھر فرمایا کہ ان (شیعہ) کا اصل عقیدہ تو یہ ہے کہ اصحاب محمد ﷺ کو گمراہ ثابت کریں۔ (ص ۱۲۶)

اسی طرح ایک صفحہ پہلے ہی خطیب بغدادی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ ہم نے پہلے ابو عبد اللہ الشافعی کی یہ بات بیان کی ہے کہ اہل ہوا لوگوں کی روایت قبول کی جاسکتی ہے سوائے روافض کے خاص طبقے کے۔ یہی بات امام اصحاب الرائے ابوحنیفہ سے بھی نقل کی گئی ہے اور قاضی ابو یوسف سے۔ (ص ۱۲۵)

امام ابوحنیفہ کی پہلی ملاقات جب جناب عطاء بن ابی رباح سے ہوئی اور طلب علم کے لئے آپ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا تو اس کا حال ابن بطلان نے شرح بخاری میں اس طرح سے لکھا ہے:

”ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے مکہ میں عطاء بن ابی رباح سے ملاقات کی اور ان سے کچھ سوال کئے۔ انہوں نے پوچھا ”تم کہاں کے ہو“، میں نے عرض کیا ”کوفہ کا“، اس پر انہوں نے فرمایا کہ ”تم اس بستی کے ہو جہاں کے لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے“، میں نے کہا جی ہاں۔ پھر انہوں نے فرمایا ”تمہارا تعلق ان میں سے کس گروہ سے ہے؟“ میں نے عرض کیا ان سے جو بزرگان سلف کی جناب میں بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں سمجھتے۔ اس پر انہوں نے فرمایا ”تمہیں دین کا عرفان ہے اسی پر جمے رہنا۔“ (تفسیر المنار، ج ۸، ص ۲۱۸)

اب کہاں تو امام صاحب اہل تشیع سے روایت تک لینے کے روادار نہ ہو، خود کو ان سے مبرا قرار دیتے ہوں اور کہاں ان کی بابت یہ خامہ فرسائی کہ ان میں تشیع تھا یا ان کا ہنی میلان شیعیت کی طرف تھا۔ امام ابوحنیفہ کوفہ میں رہے ضرور تھے لیکن اہل تشیع سے ہمیشہ متنفر ہی

رہے۔ اور جہاں تک یہ بات رہی کہ امام ابوحنیفہؒ نے اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج میں جناب زید بن علی بن حسین کی حمایت کی تھی اور وہ اس کو غزوہ بدر کے مماثل قرار دیتے تھے تو یہ بات بھی سخت لغو اور بے اصل ہے۔ جس کا ابطال ہم اوپر کر آئے ہیں اور ان شاء اللہ کتاب ہذا میں قارئین مولانا علی احمد عباسی کے قلم سے اس بابت مزید ادلہ سے مستفید ہو سکیں گے، تاہم یہ بات یاد رہے کہ جس خروج کو امام ابوحنیفہؒ کے منہ سے غزوہ بدر کے مماثل قرار دیا جاتا ہے، خود امام ابوحنیفہؒ نے اس خروج میں کوئی عملی حصہ نہ لیا بلکہ اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی بیعت پر مستقیم رہے۔

زیر نظر کتاب کی وجہ طاعتِ ثانی

الحق اس طرح کے اور کئی وضعی الزامات اور واقعات ہیں جو کہ امام ابوحنیفہؒ کی نجی و سیاسی زندگی سے متعلق کذاب راویوں نے گھڑ کر تاریخ کی کتب میں شامل کر دیئے ہیں۔ مولانا علی احمد عباسی نے اس طرح کے بیشتر واقعات کی قلمی اپنی زیر نظر کتاب امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی میں کھولی ہے۔ یہ کتاب عرصہ دراز سے ناپید تھی۔ راقم الحروف کے پاس اس کا ایک نسخہ نہایت مخدوش حالت میں موجود تھا۔ چونکہ اس احقر نے حارث پبلی کیشنز کی بنیاد رکھی ہی اس سوچ و فکر پر ہے کہ اس ادارے سے ان کتب کی اشاعت نو کی جائے جو زمانے کے نامساعد حالات کے سبب ناپید ہونے کو ہیں۔ اس سلسلے میں حارث پبلی کیشنز سے اب تک مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی کتاب سیدنا معاویہ کی سیاسی زندگی، مولانا عبد السلام مبارکپوری کی اولیاء اللہ اور تصوف اور امیر حجاج بن یوسف سے متعلق مختلف اہل علم کے مضامین پر مشتمل کتاب امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ۔ چند غلط فہمیوں کا ازالہ شائع کی جا چکی ہیں۔ اس سلسلے میں اب چوتھی کاوش مولانا علی احمد عباسی کی کتاب امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی آپ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کی اشاعت کو علم کی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ پائیں گے اور امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی سے متعلق بیشتر حقائق کا درست ادراک کر سکیں گے۔

تعارف مصنف

جب مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی کتاب سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی شائع کی تو کئی احباب نے استفسار کیا کہ آپ کو مصنف کا تعارف بھی دینا چاہیے تھا جو کہ کتاب مذکور میں موجود نہ تھا۔ سو اب جب مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی دوسری کتاب کی اشاعت کی جا رہی ہے تو مناسب خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ ان کی بابت مختصر تعارف ہدیہ قارئین کر دیا جائے۔ مولانا علی احمد عباسی مرحوم کے اجداد کے متعلق مالک رام صاحب اپنی کتاب تذکرہ معاصرین میں لکھتے ہیں کہ: ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطہ خلیفہ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلف ہارون الرشید) رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹ھ - ۸۱۲ھ) حضرت عباسؓ سے نویں پشت میں تھے۔ جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ بنی عباس مستعصم باللہ کو تہ تیغ کر دیا تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انھی خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندوستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیش نظر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور شایان شان منصب اور عہد عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آرام و آسائش سے دلی میں مقیم رہا تھا کہ اتنے میں قہر خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین یہاں سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انہوں نے وہی بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رکن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودھی کے عہد میں پنجاب سے نقل مکانی کر کے امر وہ آئے۔ عباسیان امر وہی انہی مولانا رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدین کی نویں پشت میں مولانا سید احمد علی شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحب صورت و سیرت بزرگ تھے۔ شروع میں خاندانی جاہ و ثروت سے کنارہ کش اور یاد اللہ

میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانک پوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعہ کتب دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادت الہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ ر شوال ۱۲۹ھ (۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امر وہہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید محمد علی عباسی ۱۲۴ھ (۳۱-۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دینی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی، پھر حکومت انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثناء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امر وہہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جوار حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنی زندگی میں دو نکاح کئے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ جبکہ دوسری بیوی سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے۔ انہیں سید علی محمد عباسی کے پوتے کتاب ہذا کے مصنف مولانا علی احمد عباسی مرحوم تھے۔ آپ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے، کچھ عرصہ کراچی میں قیام کر کے معاش کی غرض سے سوات منتقل ہو گئے جہاں جہانزیب کالج سوات میں آپ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسلامی تاریخ پر آپ کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کی تالیف سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی جو کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں لکھی گئی تھی، ارباب اہل علم میں کافی معروف ہوئی اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی محرکۃ الآراء کتاب خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت میں مولانا علی احمد عباسی کی اس کتاب کے حوالہ جات دیے ہیں۔ مؤلف مرحوم کا انداز بیان نہایت ہی سلیس اور آسان فہم ہوتا ہے۔ آپ کی کتابیں عموماً شروع سے لے کر آخر تک انتہائی دلچسپ اور اپنے اندر نہایت وسیع معلومات رکھتی ہیں۔ جن میں قاری کو روایات کی بھول بھلیوں میں الجھانے کے بجائے سیدھے سادھے آسان، عام فہم اور منطقی

مباحث کے ذریعے بات سمجھانے کوشش کی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی کے علاوہ مولانا علی احمد عباسی دیگر کئی نادر تحقیقات کے بھی مؤلف رہ چکے ہیں جن میں سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی اور مقتلِ احسینؑ للمؤلف ابوحنیفہؒ کا اردو ترجمہ و تعلیقات شامل ہیں۔ چونکہ مولانا علی احمد عباسی مرحوم کا تعلق مسلکِ احناف سے تھا اور یہ احقر منہجِ محدثین کا دم بھرتا ہے، اس لیے کتاب کے چند مباحث میں مؤلف مرحوم سے اختلاف ہو جانا فطری امر ہے۔ تاہم اپنی گوناگوں مصروفیت کے سبب یہ احقر مؤلف مرحوم کی کچھلی کتاب کے برخلاف اس کتاب پر حاشیہ و تعلیقات کا کام نہ کر سکا۔ یہ یاد رہے کہ یہ کتاب ایک حنفی صاحبِ علم کے قلم سے نکلی ہوئی ہے سو اس میں کئی ایسے اصولی مباحث ہو سکتے ہیں جن سے محدثین کے منہج کے بنیادی اختلافات موجود ہوں لیکن ان سب کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ حق و مسلم ہے کہ ان اختلافات سے اس کتاب کی افادیت و اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں سب سے پہلے تو اس اللہ عزوجل کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کر سکے۔ اگر اس کی مدد شامل حال نہ ہو تو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہو سکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالک کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست راشد جمال، محمد صہیب نذیر اور بلا احمد راؤ صاحبان کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہو سکا۔ اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔ علاوہ ازیں فضیلۃ الشیخ قاضی طاہر علی الہاشمی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمت بندھائی تو اس کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ کر سکا۔ اللہ ان جیسے حق گو عالم کا سایہ تازیت ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ اسی طرح اس کتاب کی اشاعت میں اور بھی چند احباب کی خصوصی مدد شامل حال رہی لیکن کیا کروں ان کی درویشانہ صفت کا کہ انہوں نے اپنے ناموں کا تذکرہ کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے، اسی لیے ان کا نام لیے بغیر ہی ان کی جناب میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی کوئی کمی نہ رہ جائے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

۶ فروری ۲۰۱۹ء



تعارف

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے سوانح و تذکرے کی یہ نئی کتاب اس اعتبار سے اور بھی قابل قدر و لائق توصیف ہے کہ امام صاحب کے مدون مذہب اور سیاسی مسلک کے بارے میں جو خلاف واقعہ روایتیں اور وصفی قصے کہانیاں صدیوں سے مشہور ہیں۔ فاضل مؤلف کتاب نے تحقیق و ریسرچ کے اعلیٰ معیار سے انہیں جانچا، پرکھا ہے۔ جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں و منکشف ہو گئی کہ یہ سارے قصے و لائسنی فضولیات اسی زہریلے پروپیگنڈے کا شاخسانہ ہیں جو اموی و عباسی خلفاء کی تنقیص اور ان علوی باغیوں کی مدح و تقدیس میں برابر و متواتر ہوتا رہا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً حکومت قائمہ کے خلاف بادعائے تفاخر نسب خروج و بغاوت کر کے غائب و خاسر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں یہ داستان سرائی بھی کی جاتی ہے کہ امام صاحب نسبتاً چونکہ ابناء فارس سے ہیں اور مولد و منشاء بھی آپ کا شیعان علی کامرکزی شہر کوفہ تھا جسے حضرت علیؑ نے اپنے مختصر سے ایام خلافت میں مدینۃ النبی کے بجائے دار الخلافہ سیاسی مصالحوں سے بنالیا تھا۔ یہ واقعہ امام صاحب کی ولادت سے کوئی چوالیس سال قبل کا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کے والد ثابت کو جو اس زمانے میں کم سن تھے۔ آپ کے دادا نے حضرت علیؑ کے حضور دعائے خیر و برکت کے لیے پیش کیا تھا۔ امام صاحب کے اجداد میں ان کے دادا ہی مشرف باسلام ہوئے تھے۔ حضرت نے اس فارسی بچے کو دعائے خیر دی تھی پس اسی ایک واقعے سے جو آپ کے والد ثابت کے بچپن کا بتایا جاتا ہے امام صاحب کو علوی خاندان کا اسدرجہ عقیدت مند ظاہر کیا گیا ہے کہ جب

کوئی علوی و فاطمی آپ کے زمانے میں خلیفہ وقت کی اطاعت سے منہ موڑ کر اور جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے شریعت کے واضح احکام کی خلاف ورزی میں خروج و بغاوت کا اقدام کر بیٹھتا۔ امام صاحب حمایت سے اس کی نہ چوکتے خفیہ خفیہ مالی امداد کیا کرتے بلکہ ایک علوی کے خروج و بغاوت کو تو کہا جاتا ہے۔ آپ نے غزوہ بدر کے معاذ اللہ مماثل قرار دے ڈالا تھا۔ لیکن اس مفروضہ غزوہ و جہاد میں بذات خود شریک ہونے کی سعادت حاصل نہ کی۔ اس ضمن میں یہ کذب بیانی بھی کی جاتی ہے کہ اموی خلافت میں تو کوڑے لگوانے کی سزا آپ کو دی گئی اور عباسی خلیفہ نے عہدہ قضا پر تقرر کرنا چاہا انکار پر قید و بند کی سزا دی بعد میں زہر دے کر مروا ڈالا۔ یہ سارے اہی قصے اور وضعی روایتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ فاضل مؤلف نے نقد و روایت سے ان فضولیات کی قلعی پوری طرح کھول دی ہے اور روایتاً ثابت کر دکھایا ہے کہ امام صاحب کی ایذا ہی و اہانت کے بجائے عباسی خلافت میں آپ کی مناسب قدر و منزلت کی گئی۔

مکہ معظمہ میں چند سال متواتر قیام کرنے کے بعد بردایت صدر الایمہ امام اعظمؒ زمانہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور عباسی کوفہ واپس آئے۔ (ج ۱، ص ۲۴) امیر المومنین کی پہلی ملاقات کو حاضر دربار ہوئے۔ امیر عیسیٰ بن موسیٰ عباسی نے ہذا عالم الدنیا الیوم [آج یہ تمام دنیا میں سب سے بڑے عالم ہیں] کہہ کر تعارف کرایا۔ فاضل مؤلف کتاب نے مستند حوالے سے بتایا کہ امیر المومنین نے فرمایا:

”اے نعمان! تم نے کہاں کہاں علم فاضل کیا ہے؟ امام اعظم نے جواباً کہا۔ کہ میں فاروق اعظم حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوا ہوں۔ امیر المومنین نے یہ سن کر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ اے نعمان! تم نے اپنا علمی رشتہ الطہیین الطاہرین المبارکین رضی اللہ عنہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہے۔“

پھر اہل علم کے بغایت قدردان و سرپرست خلیفہ نے جو بذات خود بلند پایہ عالم و محدث تھے اور ملت اسلامیہ میں باضابطہ علمی تحریک کے بانی اور جاری کرنے والے تھے۔ امام

صاحب کو بعزت و احترام اپنے پاس رکھا دینی و علمی مہمات امور کی انجام دہی ان کے سپرد کی جو امام صاحب مرتے دم تک انجام دیتے رہے۔

مودودی صاحب نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب خلافت و ملوکیت میں جس کے چند فقرے شیعہ کتابچہ نویس نے بھی درج کیے ہیں جو یہ غلط بیانی عصیت جاہلی کے جذبے سے کی ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے بذات خود غیر سرکاری طور سے فقہ کی تدوین کی۔ اس کی مکمل تردید ہماری تالیف حقیقت خلافت و ملوکیت میں کی جا چکی ہے اور فاضل مؤلف نے بھی تدوین فقہ کے اس عظیم کارنامے کا زیر سرپرستی خلافت عباسیہ انجام دیا جانا اور رائج ہونا تجس بیان مستند حوالوں سے پیش کیا ہے سبائی راویوں اور علوی باغیوں کے طرف داروں نے امام صاحب کے قید و بند اور ہتک حرمت کی روایتیں اور قصے جو تراشے ہیں محض فضولیات ہیں۔

حضرت امام اعظم کو سیاسی ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دینی اور علمی ماحول میں ساری عمر بسر کی۔ احکام شریعت کی متابعت میں اور اپنے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت عطاء بن ابی رباح کے مسلک و موقف کے اعتبار سے جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ رہے اور تعلیمات نبویہ کے مطابق خلیفہ وقت کی اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہ کر فتنہ و فساد کی تحریکوں سے محترز رہے۔ فقہائے آیت کریمہ: ان الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعاً لست منہم فی شیء [جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور گروہ (شیعہ) بن بیٹھیں (اے رسول) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں]۔ تفرقہ بازوں سے حضرت امام اعظمؒ ہی ایسے متنفر رہے کہ شیعہ راویوں سے جو صحابہ کی توہین کر کے علم دین کے لیے خطرہ ہیں اور تقیہ کا عقیدہ بھی انہیں اور مشکوک کر دیتا ہے۔ روایت لینا جائز نہ سمجھتے تھے۔ امام عبداللہ بن المبارک کی سند سے یہ قول آپ کا منقول ہے کہ اہل ہوا (اہل بدعت) سے روایت لی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔ (الا شیعة فان اصل عقیدتہم تضلیل اصحاب محمد ﷺ) لیکن شیعہ سے روایت نہ لی جائے کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور انور ﷺ کے صحابہ کی توہین تضلیل پر ہے۔ (الکفایہ فی علم الروایۃ) اب دیکھیے جو پیشوائے مذہب و امام اہل

سنت والجماعت کسی شیعہ سے روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ حضرات شیخین السیدین کی افضلیت کو مذہب اہل سنت کی پہچان بنا کر یہ فرمایا کرتے ہوں۔ ثم نقران افضل هذا الدمة اعنى خير الامم بعد نبينا محمد صلى الله عليه وسلم ابو بكرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ ثم عليؓ (کتاب الوصیۃ امام ابوحنیفہ) یعنی پھر ہم یہ اقرار کریں کہ سب سے افضل اس امت یعنی خیر الامم میں بعد ہمارے پیارے نبی اکرم ﷺ کے ابو بکرؓ ہیں پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ ان ہی پیشوا و امام اعظم کو مذہباً شیعہ بتانے کو کسی شیعہ نے جو اپنے نام کے ساتھ ”اجتہادی“ کا دم چھلا بھی لگاتے ہیں۔ ایک لچر کتابچہ اس نام سے شائع کرایا ہے۔

امام ابوحنیفہ شیعہ تھے۔ تاریخی انکشاف

مگر لطف تو یہ ہے کہ ”تاریخی بکواس“ کی کامل و مکمل تردید و تکذیب خود ان ہی کے علماء و فضلاء اس سابق کی تحریرات بالخصوص شیعیان ہند کے ”شہید ثالث“ قاضی نور اللہ شوشتری علیہ ما علیہ جیسے عالی شیعہ کی تصریحات سے ہو جاتی ہے۔ جو ان کی مشہور تالیف مجالس المؤمنین کے صفحات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ شوشتری نے بہت سے اکابر اہل تسنن جزیۃ الاسلام امام غزالی، شیخ سعدی و مولانا رومی وغیرہم کو زمرہ شیعہ میں شامل کیا ہے۔ لیکن امام اعظم کے بارے میں صاف کہہ دیا ہے کہ ”ابوحنیفہ کوفی کہ امام اعظم خواجه سفی است“ (ج ۲، ص ۲۸۰) نیز شہر کوفہ کے ذکر میں مزید لکھا ہے کہ: ”ابوحنیفہ باوجود کوفی الاصل ہونے کے مذہباً شیعہ نہ تھے۔ دار آنحالیکہ کوفیوں کا شیعہ مذہب ہونا تو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ البتہ کوفی الاصل کا سنی مذہب ہونا محتاج دلیل کا ہے۔ و اگرچہ ابوحنیفہ کوفی باشد“ (ج ۱، ص ۵۶) شوشتری کے علاوہ ایک اور شیعہ مؤلف حسن صدر الدین نے کتاب الشیعۃ وفنون اسلام میں جس کا ایک ایڈیشن شیعہ یاپدید آندگان فنون اسلام ہے۔ اس غلط بیانی کے ساتھ کہ شیعوں کو اسلامی علوم وفنون میں سنیوں پر تقدم موقوف ہے۔ علامہ سیوطی کے حوالے سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب سے پہلے شخص (اور مقصود اس شخص سے اہل سنت کے شخص سے ہے) جس نے علم فقہ میں کتاب

مدون کی ابوحنیفہ تھے۔ (ص ۷۹)

شیعہ کتابچہ نویس نے اتہام شیعہ کے ساتھ امام اعظم ابوحنیفہؒ کو شاگرد بھی زید علی بن حسین کا بتا دیا ہے اور دوسروں نے شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادقؑ کا۔ شوتری نے اس شاگردی کی حقیقت بھی شیعہ جبلت سے گستاخانہ طرز عبارت میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

شاگردی ابوحنیفہ بحضرت امام جعفر ابن قدر بودہ کہ از آنحضرت بعضے از احادیث شنیدہ و چون آنحضرت اور از مردودان میدانستند از وتقیہ می نمودہ اظهار مذهب حق بادنمی نمودہ۔ (ج ۱، ص ۵۳۶)

[حضرت امام جعفر سے ابوحنیفہ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرت سے کچھ حدیثیں سنی تھیں چونکہ وہ حضرت ان کو مردودوں میں سمجھتے تھے ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر برقہ کرتے۔]

فاضل مؤلف کتاب ہذا نے حضرت امام اعظم کے اساتذہ کرام کا تذکرہ بالتفصیل کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جعفر صادقؑ اور ان کے چچا زید بن علی بن حسینؑ کا کوئی تعلق امام صاحب کے اکتساب علم سے نہ تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا شمار تو صغارتا بعین میں ہے۔ ۲۲ صحابہ کرام میں سے جو ان کے ابتدائے عمر میں موجود تھے۔ آٹھ بزرگواروں سے ملاقات ثابت ہے۔ سالہا سال قیام مکہ معظمہ میں رہتا۔ بقول صاحب درمختار آپ نے ۵۵ حج کیے تھے۔ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوتے تو مسائل شریعت پوچھنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا تھا کہ بقول امام لیث بن سعد رایت الناس منقصصین علیہ [میں نے دیکھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں] یہ کیفیت کسی علوی و فاطمی بزرگ کی مجلس کی کہیں منقول نہیں۔ امام ابن حزم نے اپنی مشہور تالیف الملل والنحل (ج ۳، ص ۳۹) یہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جعفر صادقؑ کی کوئی برتری و فضیلت علم میں دین میں عمل میں دوسرے معاصر علماء میں محمد بن مسلم الزہری و قبیصہ بن ذؤب و غیر ہم پر نہ تھی۔ لکھا ہے کہ ”ابن عباسؓ نے اپنی فقہ میں کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش کی جائے تو

ان کی حدیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہنچے گی۔ حالانکہ حسنؒ و حسینؒ کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔ یہی حال علی بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کا بھی ہے۔ محمد بن علی (یعنی محمد باقر) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جزو تک پہنچتی ہے اور اسی طرح جعفر بن محمد (جعفر صادق۔ م) کی بھی حالانکہ روافض کا دعویٰ یہ ہے کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔ جعفر بن محمد کے بعد تو ہمیں ان ائمہ کے علم کا بالکل پتہ نہ چلا۔ نہ حدیث میں نہ فقہ میں باوجودیکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے زمانے کے قریب ہے۔“

حضرت امام ابوحنیفہؒ بیک واسطہ حضرت ابن عباس کے اور دو واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ و حضرت علیؓ و حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوئے تھے۔ ہمعصر علوی حضرات سے جو ائمہ شیعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اکتساب علم کا مطلق تعلق نہ تھا۔ ان کی علمی شان و جلالت ان حضرات سے بہت بلند تھی۔ امام ابن المبارک نے اپنے گرامی منزلت استاد کے فیوض و برکات علمی کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ:

روی اثارہ فاجاب فیہا

کطیران القصور من المنبقة

[انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلندی پر اُڑی دکھائی

جیسے شکاری پرندے بلند مقام سے اُڑ رہے ہوں۔]

ولم یکن لہ بالعراق نظیر

ولا بالمشرقین ولا بالکوفة

[نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی

نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں]

اس لچر کتابچے کے بدگوشیعی مؤلف نے حضرت امام اعظمؒ کے بارے میں یادہ گوئی کرنے کے علاوہ حضرات خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اکبر و حضرت عمر فاروق اعظمؓ و حضرت عثمان ذوالنورینؓ و دیگر صحابہ کرام کی جناب میں گستاخی کرتے ہوئے شرف صحابیت کی

تتقیص میں جو کلمات بد لکھے ہیں یا ازواج مطہرات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ دام المؤمنین حضرت حفصہؓ جیسی ذوات عالیہ کو جو نبص قرآن ومن یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحا نوتہا اجرہا مرتین بنات طاہرات حضرت فاطمہؓ وغیرہا اور تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں۔ خارج از ایمان قرار دیتے ہوئے وضعی روایت کے اشارے و کنایہ سے لکھ مارا ہے کہ ”شیعہ ان ازواج رسول کو بھی خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت ماریہؓ قبطیہ پر تہمت لگائی یا حضرت عثمانؓ کو نعتل یہودی دین سے خارج اور واجب القتل کہا۔“

شیعی راویوں کی ان من گھڑت قطعی جھوٹی اور واہی روایتوں کا کوئی خفیف سا تعلق بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے سوانح حیات سے نہیں ہے مگر آنحضرت ﷺ کی یہ دونوں اہل بیت (اہل خانہ) جن کے بارے میں کذب و افتراء یہ لغو بیان کی گئی ہے چونکہ صاحبزادیاں ہیں حضرت ابوبکر الصدیقؓ اور حضرت عمر الفاروقؓ جیسے عظمائے ملت جلیل القدر صحابہ کرام جن سے عناد و دشمنی شیعیت کی گویا اساس و بنیاد کی طرح ہے یہ بدگوشیہ کتابچہ نویس ان امہات المؤمنین کی اس طرح بے موقع و بے محل تنقیص کرنے سے بھی کیوں باز رہتا بقول یہ کہ:

نیش عقرب نہ از پیے کین است مقتضائے طبیعتش این است
حضرت علیؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کی ذات مستجمع الصفات سے کچھ ایسی عقیدت تھی کہ اپنی نوریہ سیدہ ام کلثوم بنت سیدہ فاطمہؓ بنت رسول ﷺ کو ان کی زوجیت میں دیا پھر اپنے ان داماد کے ایک دشمن اسلام سازشی کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے ان کے جنازے کے پاس کھڑے ہوئے کس حسرت سے یہ الفاظ کہے تھے اے کاش! میرے بھی کچھ اعمال ایسے ہی ہوتے جیسے ان صاحب جنازے کے ہیں مگر بدگوشیہ مؤلف نے ایک اختراعی و ابی قصے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبان سے جو حضرت علیؓ کے صاحبزادوں حسن و حسینؓ سے سن و سال میں چودہ پندرہ برس بڑے تھے یہ لغو اور بے بنیاد بات کہلوائی ہے کہ ”ایک دفعہ حسن نے عبداللہ بن عمر کو غلام زادہ کہہ دیا۔ انہوں نے باپ سے شکایت کی انہوں نے کہا لکھوا لاؤ صاحبزادہ نے لکھ دیا۔ وہ نوشتہ باپ کے پاس لائے تو انہوں نے کہا اس کو میرے کفن میں

رکھ دینا یہ سند ہے۔ غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے۔“ (ص ۵۰)

کتا بچہ نویس کی اس لالچنی بکواس کا مقصد نسل پرستی کے شیعہ عقیدے کا اظہار ہے مگر کس واہی طور سے۔ حضرت علیؑ کا خاندان بنی ہاشم اور حضرت عمرؓ کا خاندان بنی عدی قبیلہ قریش کے معزز گھرانے رشتوں میں منسلک تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی نسباً قریشی ہاشمی ہیں۔ قبیلہ قریش اور غیر قریشی عرب تفاخر نسبی میں سب سے زیادہ مبتلا تھے۔ اسلامی تعلیمات نے اس جاہلی فخر کو مٹا کر سب اہل کلمہ کو بھائی بھائی بنا دیا۔ انما المؤمنون اخوة۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے عظیم خطبہ حجۃ الوداع میں امت کو مختلف نصیحتیں و وصیتیں کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نسل و نسب کے اعتبار سے کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی کالے رنگ والے کو کسی گورے رنگ والے پر کوئی برتری و فضیلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آخرت میں، میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ تم لوگ نیک عمل کرو وہ ہی تمہارے کام آئیں گے۔ فاذا نفع فی الصور فلا انساب بینہم ولا یتساء لون (سورہ نور) (یعنی پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے (انسانوں کے) درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا۔ نہ وہ ایک دوسرے سے بات پوچھیں گے۔) نیز فرمایا گیا ہے: لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم یوم القیمۃ (یعنی تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد قیامت کے دن ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچائیں گے۔ فمن ثقلت موازینہ فاولیک ہم المفلحون) (یعنی جن کا (نیکی کا) پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ کامیاب ہوں گے۔) حضرت عمر فاروقؓ سے یہ کلمہ لالچنی منسوب کرنا ”غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے۔“ اس بدگوشی کی احتمقانہ جسارت ہے۔ شیعہ تحریک حقیقتاً عجمی پیداوار ہے۔ شیعہ اہل عجم کو حضرت ممدوح سے خاص عداوت تو اسی وجہ سے ہے کہ آپؐ ہی کے مبارک ایام خلافت میں ایران فتح ہو کر دفرش کاویانی کا پرچم ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو کر اسلام کا بول بالا ہوا تھا۔ ایک ایرانی شاعر ضیاء کردی ہی نے صحیح بات کہہ دی ہے:

بشکست عمرؒ پشت ہرمزان عجم را
برباد فنا داد رگ و ریشہٴ جم را
ایں عربدہ برغصب خلافت زعلیٰ نیست
باآلِ عمرؒ کینہ قدیم است عجم را

اہل البیت سے کلام اللہ میں مراد صرف ازواج نبی کریم ﷺ ہی سے ہے سورہ احزاب کے چوتھے رکوع میں یا نساء والنبی کہہ کر ازواج رسول اللہ ہی سے خطاب ہے ان ہی کو نصیحتیں ہیں اور ان کو رجس سے پاک کرنے کا وعدہ ہے۔ ان ہی کو اہل البیت (اہل خانہ) فرمایا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کسی اور قرابت دار کے لیے چچا ہوں یا بیٹی یہ قرآنی لفظ استعمال کرنا تحریف معنوی کے مرادف ہے۔ بیٹی جوان ہو کر بیاہی جائے وہ اپنے شوہر کی اہل بیت ہوگی نہ کہ اپنے والد کی اہل بیت کہلا سکے گی۔

اس کتاب سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہ کے فاضل مؤلف نے مورخانہ معیار تحقیق و ریسرچ سے امام صاحب کے مذہب و مسلک کے ہر پہلو کو بالوضاحت بیان کر کے ان اکاذیب و خرافات کی حقیقت عیاں کر دی ہے جو اموی و عباسی خلافت کے مخالفین نے امام صاحب کے وقائع زندگی کے سلسلے میں اپنے ذہن سے تراش تراش کر منتشر کیں۔ شیعہ کتابچہ نویس ایک طرف تو امام اعظم کو مذہباً شیعہ بتاتا ہے۔ پھر یہ بکواس بھی کرتا ہے کہ قاضی ابو یوسف نے ایک مکمل فقہ تیار کر کے اپنے استاد ابوحنیفہ کی طرف منسوب کر دیا اور فقہ حنفی وجود میں آ کر حکومت عباسیہ کا قانون بن گئی اور پانچ سو برس تک اسے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس وجہ سے کثیر التعداد مسلمان اس کے سپرد ہو گئے ورنہ ابوحنیفہ کی نہ کوئی فقہ ہے نہ وہ کسی مدرسہ فقہ کے بانی تھے نہ انہیں اپنی زندگی میں کوئی ایسا امتیاز حاصل تھا۔

قاضی ابو یوسف نے ابوحنیفہ کو امام اور مجتہد بنا دیا ورنہ کوئی انہیں جانتا بھی نہیں (ص ۷۸) اس متعصب شیعہ کو کیا معلوم کہ اسلام کے مشہور اماموں میں کسی کے اتنے اصحاب و شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام ابوحنیفہ کے ہوئے۔ فاضل مؤلف کتاب نے چند جلیل القدر

شاگردوں کے حالات یہی بیان کر دیے ہیں۔ امام الکردری نے سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو مختلف دیار و اصصار میں آپ کے شاگرد تھے۔ علامہ ابن الندیم نے اسی بہتات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

العلم برا وبحراً شرقاً وغرباً بعداً وأقرباً تدوينه رضى الله عنه یعنی دور و نزدیک مشرق و مغرب اور خشکی و تری میں ابوحنیفہؒ ہی کا علم پھیلا تھا (الفہرست، ص ۲۰۰) شیعوں کے کسی امام کے علمی وسعت کا ایسا کوئی تذکرہ کہیں نہیں الغرض فاضل مؤلف کی یہ کتاب حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے سوانح حیات اور آپ کے گرانقدر علمی خدمات کا جو خلفائے عباسی کے ایما اور سرپرستی میں انجام دیں، آئینہ ہے۔ محبت و کرم جناب عبدالعزیز صاحب کانپوری انجینئر (فردوس کالونی) اور بعض دوسرے صحیح العقیدہ مخلص صاحبان کا شکر یہ واجب ہے۔ جن کے تعاون و ہمت افزائی سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

احقر محمود احمد عباسی، کراچی

۲ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ / ۳ نومبر ۱۹۷۰ء



حوالہ جات

۱۔ شوشتری عہد اکبری میں لاہور کے قاضی تھے اور بقول شیخ علی ح: بن شیعہ تقیہ سے سنی بنے ہوئے تھے۔ اپنی تالیفات میں جو خفیہ رکھتے تھے۔ خصوصاً کتاب مجالس المؤمنین میں اکابر صحابہ کی سخت مذمت و بدگوئی کی ہے۔ علمائے حق کی شکایت پر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں طلب ہوئے۔ اپنی کتاب میں صوفیہ کے تذکرے بھی درج کیے ہیں۔ بادشاہ کے پیر اور روحانی باپ شیخ سلیم چشتی کے بارے میں پوچھا گیا۔ اجل گرفتہ شوشتری کی زبان سے بردایت مؤلف ”سوانح شہید ثالث“، ”قرم ساق سگ پدرنا تحقیق“ کلمات نکلتے ہی سزا عاً زبان گدی سے کھینچوا کر قتل کرا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ کا ہے۔



پیش لفظ

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى محمد خير النورى و
خلفايه اعلام الهدى. اما بعد

اہل پاکستان کی غالب اکثریت حنفی المذہب ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ کے متعلق عہد حاضر کے جن اہل قلم نے کتابیں لکھیں، کتابچے شائع کیے اور اخباروں، رسالوں میں مضامین طبع کرائے ان میں بلا تحقیق ایسی باتیں لکھ دیں جو عقلاً و نقلاً قابل قبول نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی اعتبار سے ہیں۔ آپ کی شخصیت، میلان طبع اور مواقف اور پھر آپ کے سلسلہ تلمذ کے بارے میں بے پایہ اور خلاف واقعہ باتیں لکھ کر بعض لوگوں نے یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ شیعہ تھے۔ یا شیعیت کی طرف رجحان رکھتے تھے نرم سے نرم بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ کی ہمدردیاں آل علی میں سے ان حضرات کے ساتھ تھیں جو قافلاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہوئے۔

اس خود ساختہ نظریے کے تحت یہ بھی ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی گئی ہے کہ حضرت امام کے نزدیک گویا اصحاب رسول ﷺ کا قائم کردہ نظام خلافت صحیح نہیں تھا۔ یعنی خلفائے اسلام کی یہ حیثیت نہ تھی کہ ان کے ساتھ تعاون کیا جائے اور شرعی بنیاد پر انہیں امام تسلیم کر کے ان کی اطاعت کی جائے۔ حضرت امام کی طرف یہ تصور منسوب کر کے ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ خلفاء بھی گویا ان سے اور ان کے شاگردوں سے کھٹکتے تھے، انہیں ایذا نہیں دیتے تھے

اور کوشش کرتے تھے کہ ان حضرات کے نظریات امت میں پھیلنے نہ پائیں۔

یہ سب باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ اس سلسلے میں صدیوں بعد کے راویوں کی غلط بیانیوں پر تکیہ کیا گیا ہے اور جن غیر محتاط مصنفوں نے اپنی کتابوں میں یہ بے حقیقت باتیں درج کر دیں، انہی کو عہد حاضر کے لوگ اپنا ماخذ بنا کر بے سوچے سمجھے یا بالقصد ایک منصوبے کے تحت نقل و نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر متقدموں کی کتابیں اور قریب العہد مصنفوں کی تحریروں سے بعد کے لوگوں کی روایات کا مقابلہ کر لیا جاتا تو صحیح صورت حال سامنے آ جاتی علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ حضرت امام مجتہد مطلق ہیں اور امت کی غالب اکثریت ان کے اجتہاد پر عمل کرتی ہے۔ اس لیے ان اہل تصنیف کی حقانیت کا تقاضا تھا کہ وہ حضرت امام کے شاگردوں اور متوسلوں کے موقف پر بھی نگاہ ڈالتے اور غور کرتے کہ جو باتیں امام صاحب کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں وہ ان کھلے ہوئے مدّ و ن مذہب سے بھی مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔

معتبر ترین ماخذ کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں اور امام صاحب کے مذہب سے بدھتائیاں ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے۔ شیعیت کی ان میں رمت بھی نہ تھی اور تعلیمات نبویہ کے مطابق وہ اجماع صحابہ کو حجت شرعیہ جانتے تھے۔ جماعت اور اس کے امام سے وابستگی ان کے نزدیک فرائض ملیہ میں تھی۔ خلیفہ وقت کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون، ان کی زندگی کا اصول تھا، وہ کسی درجے میں بھی امام جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

لوگوں نے فرقہ وارانہ اور نسلی جذبات کے تحت یہ تصور دلوں میں جا گزریں کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ائمہ اور خلافت قائمہ کے درمیان دوئی تھی اور خلفائے کرام اپنے عہد کے علماء و فقہاء پر حریفانہ نگاہ ڈالتے تھے یعنی وحدت امت مفقود تھی اور بجائے اس کے کہ تمام انفرادی و اجتماعی امور ملیہ خلیفہ و امام وقت کی قیادت میں انجام پائیں۔ صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ امت کی قیادت بٹ گئی تھی۔ علماء و فقہاء عوام کو ایک راہ لگانا چاہتے تھے اور خلفاء دوسری راہ پر۔ گویا اس طرح ایک طرف یہ بتایا گیا کہ امت سیاسی معاملات سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

اسے پروانہ رہی کہ حکومت وقت کیسی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں اور دوسری طرف اس کی شہرت دی گئی کہ خلفاء بھی من مانی کرتے تھے۔ امت کی فلاح و بہبود سے انہیں غرض نہ تھی جو رواستبداد پران کا مدار تھا۔ کیونکہ علماء و فقہاء نے یہ تیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ خلافت قائمہ سے عدم تعاون کریں، ان کے مناصب قبول کرنے پر تیار نہ ہوں اور موقعہ بے موقعہ ان کی مخالفت پڑے رہیں۔

چنانچہ جوائمہ فقہ و حدیث امت میں اپنا مقام رکھتے ہیں ان کے متعلق عموماً ایسی روایتوں کو شہرت دی گئی جن سے معلوم ہو کہ وہ حکومت کی اطاعت واجب نہیں جانتے تھے اور حکومت بھی ان پر ظلم و ستم توڑتی رہتی تھی۔ یہ سب خیالی فضا محض اس لیے قائم کی گئی ہے کہ اس سیاسی نظام کی حیثیت شرعی نہ رہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اور امت اسی نظام کی خوگر ہو گئی تھی۔

پھر جن علماء و فقہاء کو حکومت کے مناصب پر دیکھا اور امت میں ان کی مقبولیت پائی۔ یا تو ملت کے اندرونی دشمنوں نے ان کی علمی اور روحانی عظمت کم کرنے کے لیے انہیں خلفاء کا آلہ کار بنانے کی کوشش کی یا جب اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو بیان کیا کہ خلفاء تو ان پر رعب حکومت ڈالتے تھے۔ مگر وہ ان کا رعب مانتے نہ تھے اور ان کے سامنے کلمہ حق کہہ کر جہاد اکبر کرتے رہتے تھے۔ یعنی ائمہ فقہ و حدیث اور خلافت قائمہ کے درمیان ہمیشہ خلفشار قائم رہا اور باہمی تعاون و احترام و یک جہتی کے ساتھ فرائض ملیہ ادا کرنے کی سبیل نہ رہی۔

گویا جس امت کو اللہ تعالیٰ نے خیر امت فرمایا ہے، اہل عالم کے لیے نمونہ بنایا ہے اور اسے بشارت دی ہے کہ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھے گا وہ امت ان کے خیال میں آج تک شرف امت چلی آتی ہے۔ اصحاب رسول اللہ ﷺ اور ان کے دامن سے وابستہ جماعت المسلمین سب کا ایک ہی حال تھا۔ یعنی وہ زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے اور جو ۲۵۰ھ میں ختم ہوا، اسی مدت میں دین مسخ ہو گیا، امت گم راہ ہو گئی اور بقول مودودی صاحب اس کی قیادت ۴۰ھ کے بعد جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تصور کے باوجود دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دین اسلام ایک زندہ و پابندہ تحریک ہے۔ جس کا نور پورا ہو کر رہے گا۔ اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کی فطرت ہی ایسی رکھی ہے کہ یہ کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہوتی اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی غلط روش شخص اپنے ”نسب و علم و تقدس“ کے دام میں اسے پھنسا سکے یہ جب مجتمع ہوگی تو اس نظریے پر جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا اور جس میں امت کی فلاح ہوگی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ امت تین چوتھائی متمدن دنیا پر چھا گئی اور تیسری صدی کی نصف سے پہلے پہل اہل عالم پر اپنا ذہنی اور روحانی تفوق اس طرح ثابت کر دیا کہ زندگی کے ہر نظام اور اسی کے مقرر کردہ منہاج کی پیروی کر کے دنیا کے لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری جو تاریخ امت کا سیاہ ترین دور ہے اور جس میں عجمی طاقتوں نے سیاسی تفوق حاصل کر کے دین مبین کو مسخ اور دعوت محمدیہ کو فنا کرنے کی کسی سازش سے دریغ نہیں کیا، وہ اپنی کوششوں میں اسی لیے پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے کہ مسلمانوں نے خیر القرون میں اپنا دین مدون و محفوظ کر لیا تھا اور اپنا لائحہ عمل ایسا رکھا تھا کہ ہر تخریبی تحریک فنا کے گھاٹ اترتی رہی اور امت کی مجموعی قوت نے رہ رہ کر غلبہ حاصل کر لیا۔

تاریخ اسلام کی یہی روئداد ہے۔ اسی لیے ملت کے اندرونی دشمنوں نے عاجز آ کر تصنیف و تالیف کا سہارا لیا اور روایات و اہیہ کی بھرمار سے اپنی سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔ مگر آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ ہے اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی کرامت کہ ایسی جتنی بھی روایتیں ہیں ان میں قدرتی تضاد پیدا ہو گیا اور اس طرح ان روایات کی اندرونی و بیرونی شہادتیں ان کے بے پایہ ہونے کی منہ بولتی تصویریں بن کر ابھر آتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم مناظر احسن گیلانی مرحوم جنہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی لکھی، یا مودودی صاحب جنہوں نے حال ہی میں اپنی رسوائے زمانہ کتاب خلافت و ملوکیت لکھ کر امت پر اور خود اپنے اوپر ظلم عظیم کیا ہے، یا مصر کے مشہور مصنف شیخ ابوزہرہ المصری، جنہوں نے ائمہ اربعہ پر کتابیں لکھیں، ان میں کسی نے ان ائمہ کی شخصیتوں اور ان جیسی غیر سیاسی اور علمی ہستیوں کے ”سیاسی“ مواقف پر تبصرہ کرتے ہوئے تحقیق سے قطعاً کام

نہیں لیا۔ بلکہ درایت سے منہ موڑ کر صدیوں بعد کے غیر محتاط مؤلفوں کی متضاد خرافات پر تکیہ کر کے وہ باتیں ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں جو کسی طرح تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کی جاسکتیں۔

مصری عالم احمد امین کا بھی اس سلسلے میں بڑا مقام ہے۔ انہوں نے امت کے ثقافتی ارتقاء و زوال پر فجر اسلام، ظہر الاسلام وغیرہ کتابیں لکھیں۔ ان کا مطمح نظر تو ادب تھا مگر دوسری باتیں بھی آگئیں ہیں۔ عہد حاضر کے ذہنی جمود بلکہ پستی کے زمانے میں شخص واحد کا اس طرح کام کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن افسوس کہ تاریخی امور میں ان کا زیادہ انحصار الاغانی پر ہے جس میں رطب و یابس بلکہ بے پایہ روایتوں کی اتنی کثرت ہے کہ اہل تحقیق کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں اور وقائع تاریخیہ میں اس سے بے محابا استناد کسی درجے میں درست نہیں سمجھا جاسکتا۔ صاحب کتاب اگرچہ نسبتاً اموی ہیں لیکن شیعہ المشرق آل حمدان کے دربار سے وابستگی کے سبب وہ غلط راہ پر پڑ گئے اور ایسی لغو باتیں لکھ گئے جن کی رکاکت عیاں ہے۔ اس کے باوجود احمد امین نے جگہ جگہ الاغانی سے استناد کیا ہے۔

عوام کو فقہی آراء اور مذہبی نکات سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی ائمہ کی شخصیتوں کے ذاتی اور صفاتی احوال سے۔ اس لیے ملت سے وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں مقدر بھر تحقیق کر کے بات کہی جائے۔ تاکہ ان کے حقیقی خط و خال نمایاں ہوں۔ ہمارے پیش نظر چونکہ اس وقت امام اعظم ابوحنیفہ کی شخصیت ہے۔ اس لیے ہم ان فضولیات اور لغوبات کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں جو بے احتیاطی سے یا اپنے مفسدانہ عزائم کے تحت لوگوں نے لکھ ماری ہیں اور برابر انہیں شہرت دے رہے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کو شیعیت سے متہم کر کے لغو بیانی کی جسارت بھی کی گئی ہے۔

علی احمد عباسی

سید و شریف سوات

شخصیت امام اعظم ابوحنیفہؒ

نام و نسب

امام صاحب کا خاندان عجمی الاصل ہے، عرب خاندان تیم اللات سے جو قبائل الخزرج (انصار) سے کوفہ میں مسکن گزین تھا۔ ان کا رشتہ ”ولاء“ تھا۔ ولاء تین معنی کے لیے مستعمل ہے ایک یہ کہ آدمی جنگی قیدی بن کر آئے اور وہ ایسا ہو کہ نہ اسے احسان رکھ کر چھوڑا جاسکے اور نہ فدیہ لے کر۔ پھر دشمن اس تبادلے میں واپس لینے پر بھی تیار نہ ہو۔ ایسے جنگی قیدیوں کو مختلف مجاہدوں کا مملوک بنادیا جاتا تھا اور ملکیت میں دیتے وقت آقا اور مملوک دونوں کی معاشرتی حیثیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ قانوناً یہ مملوک اپنے آقاؤں کے گھر والوں ہی کی طرح ہو جاتے تھے، ان کے کھانے پینے کا انداز حکماً وہی رکھا جاتا تھا جو گھر والوں کا ہو۔ اگر ان کا آقا انہیں آزاد کر دے تب بھی یہ اسی خاندان سے وابستہ رہتے تھے اور اسی قبیلے میں ان کا شمار ہوتا تھا اور یہ موالی کہلاتے تھے۔ ان مولی القوم منہم [ایک قوم کا مولیٰ انہیں میں ہوتا ہے] امام صاحب کے خاندانی ولاء کی یہ صورت نہ تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غیر عرب آزاد قبائل کو امیر المومنین اپنی ذاتی سرپرستی میں لیں اور جیسے امیر المومنین ہشام نے بعض قبائل عجم کو یہ شرف بخشا تھا اور وہ موالی امیر المومنین کہلاتے تھے۔ امام صاحب کی ولاء اس معنی میں بھی نہ تھی۔

تیسرا دستور تھا کہ آزاد غیر عرب کسی عربی قبیلے میں رضا کارانہ شامل ہو جاتا تھا اور وہ قبیلہ اسے اور اس کے خاندان کو قبول کر لیتا تھا۔ حضرت امام صاحب کی ولاء اسی قسم کی تھی۔ آپ کے دادا

زوطی نے اپنا رشتہ ولایت قبیلہ تیمم اللات سے استوار کر لیا تھا۔ جن کا خاندان کوفہ میں مسکن گزین تھا۔ اس طرح ان کے حقوق وہی ہو گئے جو اس قبیلے کے تھے۔ یہ صورت عرب و عجم کا فرق مٹانے کی تھی۔

امیر المؤمنین حضرت عمر الفاروقؓ کے عہد مبارک میں جب دیوان مرتب ہوا اور تمام قبائل کے سرکاری وظائف تجویز کیے گئے تو جو لوگ بالولاء کسی قبیلے میں شامل ہو گئے تھے ان کے وظیفے کا معیار بھی وہی رکھا گیا جو اس قبیلے کا تھا۔ امام شافعی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الام میں اس کی بعض تفصیلات دی ہیں۔ (ج ۴ ص ۱۵۸، طبع مصر، مکتبۃ الزہریہ) دیوان کا یہ نظام خلافت اسلامیہ میں صدیوں قائم رہا۔ امیر المؤمنین المہدی عباسی کے زمانے تک باقی رہنے کا دستاویزی ثبوت الام کی یہی روایت ہے۔

مملوکوں کو سرکاری وظیفہ نہیں ملتا تھا کیونکہ ان کے تمام اخراجات ان کے آقاؤں کے ذمے تھے لیکن امیر المؤمنین عثمان الشہید الاکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر ولید بن عقبہ کی گزارش پر مملوکوں کا بھی سرکاری خزانے سے وظیفہ مقرر کر کے ان کی معاشرتی حیثیت بڑھا دی۔ طبری نے یہ بات امام شافعی کے حوالے سے بیان کی ہے۔

امام صاحب کے نسب کے سلسلے میں آپ کے جد بزرگوار زوطی تک سب کا اتفاق ہے اس سے آگے جو کہا گیا وہ بے ثبوت ہے۔ بعض لوگوں نے (زوطی) کے باپ دادا کو مسلمان عرب ثابت کرنے کے لیے آپ کا نسب نامہ اس طرح مرتب کر ڈالا۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن ثابت الانصاری التیمی تیم بن ثعلبہ (الہم المصیب فی الرد علی الخطیب، ص ۳۷ طبع دیوبند) لیکن یہ محض اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے اور کسی درجے میں مستحسن نہیں۔

امام طحاوی نے مشکل آثار میں امام صاحب کا بالولاء تیمی ہونا خود ان کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے:

قال ابو عبد الرحمن المقرئ اتيت ابا حنيفة فقال لي من الرجل؟
فقلت رجل من الله عليه بالاسلام فقال لي لا تغفل هكذا ولكن وال
بعض هذه الاحياء ثم انتم اليهم فاني كنت انا كذا الك.

ابو عبد الرحمن مقرئ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے پوچھا

”کون ہو تم“ میں نے عرض کیا ایک شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا ہے (یعنی نومسلم) آپ نے فرمایا ”یوں مت کہو“ بلکہ ان عرب قبیلوں میں کسی سے رشتہ ولاء قائم کر لو اور پھر تم لوگ انہی میں ہو جاؤ گے خود میں بھی ایسا ہی تھا۔

گویا تیم اللات سے آپ کی نسبت ولاء کی تھی نہ کہ تیم بن ثعلبہ سے نسبی اور صحیح طریقہ لکھنے کا یہ ہے ”التیمی بالولاء“ ویسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو شرف عطا فرمایا ہے اور جس رفعت سے نوازا ہے وہاں نسب کی کیا حاجت۔ آپ کے دادا زوطی اسلام لائے تھے اور ان زوطی کے دادا کا مسلمان یا عرب ہونا قطعاً غلط ہے۔ کوفہ میں آنے والے آپ کے پہلے بزرگ یہی زوطی تھے اور یہ وہ وقت تھا جب امیر المومنین علیؑ نے مدینہ کے بجائے اس بستی کو اپنا دار الخلافہ بنا لیا تھا۔ اس طرح یہ طبعی بات تھی کہ جناب زوطی کو حضرت علیؑ سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فرزند ثابت کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کیا تھا اور آپ نے ان کے لیے دعائیں کی تھیں۔ ان ہی ثابت بن زوطی کے فرزند جناب نعمان (ابوحنیفہ) تھے۔

حیثیت عرفی

طبقہ کے اعتبار سے امام صاحب صفارتا بعین میں ہیں متعدد صحابہ کرام کی آپ نے زیارت کی تھی، مگر تمام علم آپ کا کبارتا بعین کے فیوض پر مبنی ہے۔ تاریخ بغداد میں ہے (ج ۱۴، ص ۳۳۴)

دخل ابو حنیفہ یوماً علی المنصور وعنده عیسیٰ بن موسیٰ فقال
للمنصور هذا عالم الدنيا اليوم. فقال له يا نعمان عمن اخذت العلم؟
قال عن اصحاب عمر عن عمر، وعن اصحاب علی عن علی وعن
اصحاب عبد الله عن عبد الله وعن اصحاب ابن عباس عن ابن
عباس وما كان فری وقت ابن عباس علی وجه الارض اعلم منه قال
لقد استوثقت لنفسك

ایک دن ابوحنیفہ (خلیفہ) المنصور کے پاس آئے وہاں عیسیٰ بن موسیٰ عباسی بھی تھے

انہوں نے المنصور سے عرض کیا، آج ساری دنیا میں یہ سب سے بڑے عالم ہیں (خلیفہ المنصور) نے پوچھا نعمان تم نے کہاں کہاں علم حاصل کیا، عرض کیا اصحاب عمر سے عمر کا، اصحاب علی سے علی کا، اصحاب عبداللہ (بن مسعود) سے عبداللہ کا اور اصحاب ابن عباس سے ابن عباس کا اور ابن عباس کے وقت میں روئے زمین پر ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ فرمایا تم نے اپنے نفس کی تکمیل بہت مضبوطی سے کی ہے۔]

اسی طرح ”دیار بکری“ کی تاریخ خمیس میں ہے (ص ۶۴، طبع اولے ۱۳۰۲ھ)

قال ابو حنیفہ دخلت علی ابی جعفر امیر المومنین فقال لی عنمن اخذت العلم؟ قال قلت عن حماد عن ابراهیم عن عمر الخطاب وعن علی بن ابی طالب وعبدالله بن مسعود وعبدالله بن العباس قال بخ بخ استوثقت ماشئت یا ایا حنیفہ الطیین الطاهرین المبارکین رضی اللہ عنہم۔

[امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں میں ابو جعفر (المنصور) امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے پوچھا تم نے علم کہاں سے حاصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا امام حماد سے انہوں نے امام ابراہیم سے انہوں نے (امیر المومنین) عمر بن الخطاب سے (امیر المومنین) علی بن ابی طالب سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے اور حضرت عبداللہ بن عباس سے، فرمایا واہ واہ ابو حنیفہ تم نے اپنا مقصد پختگی کے ساتھ بڑے خوب و پاک اور مبارک حضرات سے حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔]

یہ صورت حال ان دونوں عظیم ہستیوں کی پہلی ملاقات کی ہے اس سے بھی واضح ہوا کہ امام صاحب کو صحابہ کرام کے بجائے ان کے اصحاب سے فیض ہے۔ ویسے آپ نے جن صحابہ کرام کی زیارت کی، ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی کہ حضرت امام ان سے بخوبی استفادہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے ان صحابہ سے آپ کی بلا واسطہ روایتیں نقل بھی کی ہیں، لیکن ان کا ثبوت نہیں ملا اور نہ امام صاحب نے ان سے اپنی کوئی روایت بیان کی ورنہ

کتاب الآثار (جو آپ کے شاگردوں نے آپ سے روایت کی ہے) اس میں کچھ تو اشارہ ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ معمر صحابہ اپنے آخری زمانے میں نبی ﷺ کا کوئی ارشاد نقل کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں امتداد زمانہ کے سبب کوئی غلطی نہ ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں روایت بیان کرنے کی شرط بڑی سخت ہے۔ وہ صرف ایسی روایت کرنا جائز سمجھتے ہیں جو بالکل اسی طرح یاد ہو جس طرح پہلی دفعہ سنی۔ امام طحاوی نے بسند متصل لکھا ہے:

قال ابو حنیفہ لا یبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظہ

من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ

[ابوحنیفہ نے فرمایا کہ کسی شخص کو کوئی حدیث بیان کرنی جائز نہیں جب تک اسے

روایت کرتے وقت بالکل اسی طرح یاد نہ ہو جس طرح پہلی مرتبہ سنی تھی۔]

وہ تو اس بارے میں اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی روایت دیکھے جو اسے پہلے سے زبانی یاد نہ ہو تو وہ اس کی روایت کی بھی اجازت نہیں دیتے (الکفایہ فی علم الروایہ ص ۲۳، طبع حیدرآباد دکن) بہر حال امام صاحب نے جن صحابہ کی زیارت کی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مدینہ طیبہ: حضرت سہیل بن سعد الساعدی (م ۹۸ھ) مدینہ میں وفات پانے والے آخری صحابی۔

۲۔ بصرہ: حضرت انس بن مالک (م ۸۷ھ) بصرہ میں وفات پانے والے آخری صحابی۔ امام صاحب نے ان کی زیارت متعدد بار کی۔

۳۔ کوفہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (م ۸۷ھ) کوفہ میں وفات پانے والے آخری صحابی یہیں صغار صحابہ میں ابو الطفیل عامر بن واہلہ کو بھی دیکھا (م ۱۰۰ھ)۔

بعض لوگوں نے دوسرے صحابہ کے بھی نام لیے ہیں لیکن ان کی زیارت کا ثبوت ملنا مشکل ہے کیونکہ امام صاحب بعہد امیر المومنین عبدالملک ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے جو صحابہ اوپر مذکور ہونے ان کی زیارت کر سکتے تھے اور ان سے روایت کا بھی امکان تھا لیکن حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزالہ بیدی (م ۸۶ھ) جو مصر میں وفات پانے والے آخری صحابی ہیں اور وہیں رہتے

تھے، یا حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری (م ۶۸ھ) کی زیارت کا امکان نہ تھا۔ چہ جائیکہ ان سے بلا واسطہ روایت کریں البتہ حضرت یحییٰ بن معین نے جو جرح و تعدیل کے امام ہیں آپ کی روایت سیدہ عائشہ بنت عجرؓ سے سننے کی توثیق کی ہے اور یہ بڑی سعادت ہے لیکن امام صاحب کے اپنے شاگردوں نے آپ کی جو مرديات نقل کی ہیں وہ کسی صحابی سے نہیں ہیں بلکہ تابعین سے ہیں۔ بات وہی معلوم ہوئی ہے کہ ان میں سے ہر صاحب شیخ فانی کے درجے میں تھے، انہیں خود ارشادات نبویہ نقل کرنے سے احتراز تھا اور دوسرے امام صاحب کو اخذ روایت کے سلسلے میں بڑی شدت تھی یعنی آپ نے جو کچھ سنا بھی ہو تو اسے روایت نہیں کیا۔ ورنہ سات، گیارہ، اٹھارہ اور بیس برس کی عمر میں آدمی بخوبی روایت کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ زمانہ ایسا ہو کہ اصحاب پاک دنیا سے اٹھتے جا رہے ہوں وہ زمانہ نہایت حرص کے ساتھ ان کی زیارت کرنے اور ان سے استفادے کا تھا۔ حضرت امام نے جن شیوخ سے استفادہ کیا وہ عموماً ہر قسم کی اندرونی سیاسی سرگرمیوں سے بے تعلق ہو کر محض علمی زندگی میں غرق تھے اور حسب تعلیمات ربانیہ (التوبہ: ۱۲۲) انہوں نے اپنے آپ کو ترویج علوم کے لیے وقف کر دیا تھا اور عملی سیاست میں حصّہ لے کر وقت ضائع کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہی مسلک امام اعظم کا تھا۔ آپ نے علمی سیاست سے کچھ سروکار نہ رکھا، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ عملی زندگی میں یکسوئی سے مشغول رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاش کی طرف سے بے فکر تھے۔ آپ کے ہاں کپڑے کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ معتمد گماشتے دور دور مال لے جاتے تھے، اس آمدنی سے آپ نے تعلیم کی اشاعت کا کام لیا، جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، اسے معاش کی طرف سے بے فکر کر کے تحصیل علم پر لگا دیا۔ امام یوسف ایسے ہی خوش بخت حضرات میں تھے۔

کوفہ

فتح ایران کے بعد حضرت امام اعظمؒ کے فرمان کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نیا شہر بسایا، جو عرب و عجم کے درمیان بہت بڑی چھاؤنی تھی اور تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ کی توجہ اس بستی کی طرف بہت تھی تاکہ دین کی جڑیں یہاں مضبوط ہوں اور تہذیبوں

کے تصادم کا نتیجہ تحریر میں نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بہت جلد یہ شہر دنیاۓ اسلام کا علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا اور یہ سب کچھ اس کے دار الخلافہ بننے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، حافظ ابوالبشر دلالی نے کتاب الکئی والاسماء میں حضرت قتادہ کے حوالے سے بیان کیا ہے:

عن قتاده قال نزل الكوفة الف وخمسون رجلاً من اصحاب النبی
صلی اللہ علیہ وسلم واربعة وعشرون من اهل بدر.

[حضرت قتادہؒ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ کوفہ میں ایک ہزار پچاس حضرات
اصحاب رسول خدا ﷺ میں سے یہاں تشریف لائے اور چوبیس اصحاب بدر۔]

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بانی کوفہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ
اشعریؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت براء بن عازبؓ وغیرہم کو حضرت
فاروق اعظمؓ نے وقافو قفا یہاں بھیجا تھا، نظم و نسق کے علاوہ یہ حضرات دین کی تعلیم بھی دیتے تھے
اور ان میں سب سے بڑی مسند عبداللہ بن مسعودؓ کی تھی۔

اس کے بعد امیر المومنین معاویہؓ کے عہد مبارک و مسعود میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور
حضرت جریر بن عبداللہؓ نے مسند ارشاد سجا ئی۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

”کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، علی بن ابی طالبؓ جیسے حضرات نیز
صحابہ کرام کی کثیر تعداد نے اس شہر کو رونق بخشی۔ پھر علقمہ، مسروق اور اسود جیسے
ائمہ تابعین ہوئے۔ پھر شععی، نخعی، حکیم بن عتیہ، حماد، ابواسحق منصور اور اعمش جیسے
ان کے اصحاب ہوئے اور یوں ابن عقدہ کے زمانے تک وہاں علم کی کثرت رہی
(یعنی چوتھی صدی تک)۔“

ابو عبداللہ الحاکم کا بیان ہے کہ چوتھی صدی تک وہاں صحابہ کرام کی درسگاہوں کے
نشانات باقی تھے فرماتے ہیں:

”میں کوفہ میں سب سے پہلے ۳۳۱ھ میں داخل ہوا۔ ابوالحسن بن عقبہ شیبانی نے
مجھے ایک ایک صحابی کی مسجد دکھائی اور میں ان سب مسجدوں میں گیا۔ اس وقت یہ

مسجدیں (مراکز علمی کی حیثیت سے) آباد تھیں۔ ہم نے اپنا ٹھکانہ حضرت جریر بن عبداللہؒ کی مسجد کو بنایا۔ (معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۹۱)

لہذا لوگوں کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کوفہ کی علمی حیثیت دارالخلافہ بننے کے بعد بنی۔ موقوف المکی نے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ کو فہ تشریف لائے تو وہاں کی مسجدوں کو حضرت عبداللہ مسعودؓ کے تلامذہ سے بھر پایا۔

لقد ترک ابن ام عبدالعینی ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہولاء سرج الکوفہ [ابن ام عبدالعینی ابن مسعودؓ نے کوفہ میں یہ روشن چراغ چھوڑے ہیں۔]

غرض یہ ہے کہ کوفہ میں دارالخلافہ بننے سے پہلے ہی یہ شہر علوم اسلامیہ کا مرکز بن چکا تھا۔ حضرت علیؑ کا قیام یہاں جتنے دن رہا وہ زمانہ فتون کا تھا۔ اس لیے آپ کے فیوض سے اہل کوفہ نے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

وانما ظهر علم علی وفقہہ فی الکوفہ بحسب مقام فیہا مدہ خلافة۔ [حضرت علیؑ کا علم اور آپ کے فقہ کا ظہور کوفہ میں اتنے ہی دن رہا جتنے دن آپ خلافت کے دوران وہاں رہے۔] (منہاج السنہ، ج ۴، ص ۱۳۷)

پھر فرماتے ہیں:

فانما کان الغالب علمہ فی الکوفہ ومع هذا فاهل الکوفہ کانوا یعلمون القرآن والسنة قبل ان یتولی عثمان فضلاً عن علی۔ [ان کے (یعنی حضرت علیؑ کے) علم کا ظہور زیادہ تر کوفہ میں ہوا۔ مگر ساتھ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت میں تو کیا، وہاں حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے سے بھی پہلے کتاب و سنت کا علم عام تھا۔]

ساتھ ہی آپ نے وجہ بتائی ہے۔ (ص ۱۴۲)

فان اهل الکوفہ التی کانت دارہ کانوا اقد تعلموا الایمان والقران وتفسیرہ والفقه والسنة عن ابن مسعود وغيرہ قبل ان یقدم علی الکوفہ۔

[کیونکہ کوفہ جو آپ کا گھر تھا، وہاں کے لوگ ایمانیات، قرآن اور اس کی تفسیر اور فقہ و سنت کا علم ابن مسعودؓ وغیرہ کی خدمت میں حضرت علیؓ کی تشریف آوری سے پہلے حاصل کر چکے تھے۔]

اسی طرح تصریح فرماتے ہیں: (ص ۱۵۷)

ولما ذهب الى الكوفة كان اهل الكوفة قبل ان ياتيهم قد اخذوا الدين عن سعد بن ابى وقاص وابن مسعود وحذيفه وعمار وابى موسى وغيرهم ممن ارسله عمر الى الكوفة.

[جب وہ (یعنی حضرت علیؓ) کوفہ گئے ہیں تو ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی اہل کوفہ نے دین کا علم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابوموسیٰؓ وغیرہ حضرات سے حاصل کر رکھا تھا جنہیں حضرت فاروق اعظمؓ نے وقتاً فوقتاً کوفہ بھیجا۔]

محض اتنا ہی نہ تھا کہ اہل کوفہ اس علم پر اکتفا کریں جو انہیں کوفہ میں حاصل ہوا بلکہ وہ مدینے میں حاضر ہو کر وہاں سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ (منہاج السنہ، ج ۴، ص ۱۴۲)

هو (يعنى ابا عبد الرحمن السلمى) وغيره من علماء الكوفة مثل علقمه والاسود والحارث الليثي وزر ابن حبيش الذى قرأ عليه عاصم بن ابى الجنود. اخذوا القرآن عن ابن مسعود وكانوا يذهبون الى المدينة فيأخذون عن عمر وعائشة.

[وہ (یعنی حضرت ابو عبد الرحمن السلمیؓ) وغیرہ علماء کوفہ مثلاً حضرت علقمہ، حضرت اسود، حضرت حارث لیثی، حضرت زر بن حبیش جن سے حضرت عاصم بن الجنود نے تجوید کا علم حاصل کیا، ان حضرات نے قرآن مجید کا علم حضرت ابن مسعود سے حاصل کیا تھا اور پھر مدینے جایا کرتے تھے تاکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ام المومنین عائشہؓ سے استفادہ کریں۔]

موافق اساتذہ

امام اعظم جب تحصیل علم کے قابل ہوئے اور امام حماد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تو اپنے اساتذہ کرام ہی کے طریقے پر چلے اور ان اساتذہ کا علم یہ تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ جو علوم انہیں کونے کے دار الخلافہ بننے سے پہلے حاصل ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت علیؑ کے ایام خلافت سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ حضرت علیؑ کی زندگی کے آخری ایام جو کونے میں گزرے ان کے لیے اتنے پریشان کن تھے اور ایسی ایسی مشکلات سامنے آتی رہتی تھیں جنہیں حل کرنے سے ہی آپ کو فرصت نہ ملتی تھی۔ ان ہنگاموں نے آپ کو ایسا زچ کر رکھا تھا کہ علمی مسند سنبھالنے کا موقع نہ مل سکا۔ گویا اس عرصے میں امام اعظم کے اساتذہ کو ان سے استفادے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اس کی حیثیت ذیلی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ارتقاء علمی میں حضرت علیؑ کی تشریف آوری کچھ مدد ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو علم ان کے پاس پہلے سے تھا اسی پر وہ مطمئن رہے اور فقہ علوی کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی رہی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

واعلم ان اهل الكوفة واصحاب ابن مسعود لعلقمه والا سود
وشريح الحارث بن قيس وعبيدة السلماني ومسروق وزربن
حبيش وابى وائل وغيرهم كانوا يضاون علم عمرو ابن مسعود دون
قول عليؑ.

[جان لو کہ اہل کوفہ اور اصحاب ابن مسعود، مثلاً علقمہ، اسود، شرح، حارث بن قیس، عبیدہ سلمانی، مسروق، زربن حبیش اور ابو وائل وغیرہم، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے علم کو حضرت علیؑ کے علم پر ترجیح دیا کرتے تھے۔] (منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۰)

حضرت شرح جو امیر المومنین حضرت علیؑ کے قاضی تھے وہ فقہی مسائل میں اپنا اجتہاد کام میں لاتے تھے۔ (منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۱-۱۴۲)

وشريح قاضيه (ای قاضی امیر المومنین علی) انما تفقه علی معاذ
بن جبل باليمن وكان يناظره في الفقه ولا يقلده.

ان کے (یعنی) امیر المومنین علیؑ کے قاضی (حضرت) شریح نے تمام علم حضرت معاذ بن جبلؓ سے یمن میں حاصل کیا تھا اور فقہی مسائل میں وہ ان سے (یعنی حضرت علیؑ سے) مناظرہ کیا کرتے تھے اور ان کی تقلید نہیں کرتے تھے۔

حضرت علیؑ کے ایک دوسرے قاضی حضرت عبیدہ سلمانی کا بھی یہی حال تھا۔ ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؑ نے کوفہ میں فرمایا میں پہلے تو ام الولد کو فروخت نہ کرنے کے سلسلے میں خلفاء پیشین کے مطابق رائے رکھتا تھا لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ اس پر آپ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے اٹھ کر کہا: ”آپ کی جو رائے جماعت کے ساتھ تھی وہی ہمیں آپ کے اکیلے کی رائے سے زیادہ قابل قبول ہے۔“ آپ نے فرمایا: ”اچھا تو جیسا دستور چلا آ رہا ہے اسی کو قائم رکھو۔“ مسئلہ یہ تھا کہ جس باندی سے اولاد ہو جائے وہ اپنے آقا کی وفات پر خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایسی باندی (ام الولد) کو فروخت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اولاد ہو جانے سے وہ عملاً مثل آزاد بیوی کے ہوگئی۔ ایسے ہی اور بھی فقہی اور تفسیری مسائل ہیں، جہاں علماء کوفہ نے اپنی انفرادی رائے کے مقابلے میں اجتماعی مذہب کے مطابق اپنا دستور العمل رکھا۔

ایک مشکل اور یہ آن پڑی تھی کہ حضرت علیؑ کو جو لوگ گھیرے ہوئے تھے وہ آپ کی موجودگی میں بھی غلط بیانی کر بیٹھتے تھے۔ آپ کی رائے کے خلاف چلتے تھے اور آپ کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیتے تھے، جو آپ کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوتیں اور پھر معلوم ہونے پر آپ کو ان کی تردید کرنی پڑتی تھی۔ وقائع تاریخی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، اس لیے علماء فقہاء کوفہ آپ سے صرف وہی باتیں لیتے تھے جو خود اپنے کانوں سے سنیں اور ہنگامی احوال کے تحت ایسے مواقع کم ہی ہوتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اہل کوفہ آپ کے علم سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جو پر امن ماحول میں اٹھاتے، آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آپ کے فتاوے کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا تو آپ نے قلم اٹھایا اور کاٹے چلے گئے۔ بار بار فرماتے ”واللہ علی نے یہ ہرگز نہیں کہا ہوگا“ اس مجموعے میں بہت تھوڑی باتیں ایسی رہ گئیں جو حضرت ابن عباسؓ نے آپ کی سمجھیں۔ یہ حال تھا اقوال علیؑ کا۔ امام مسلم

نے اپنے مقدمے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی لیے ان حضرات کے ہاں حضرت علیؑ سے سنی ہوئی روایات بہت تھوڑی ہیں اور ایسی کہ ان پر کسی فقہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ چنانچہ یہ بات وہی رہی جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ علماء کوفہ کے ہاں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشادات پر زیادہ تکیہ تھا۔

الشیوخ والفقہاء

علوم نبویہ کے حامل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شیوخ کہلاتے ہیں یعنی محدث اور دوسرے وہ جنہیں فقیہ کہا جاتا ہے۔ شیوخ یعنی محدثوں کا موضوع یہ ہے کہ حدیث کی روایت کریں، اسناد اور متن کی صحت و سقم سے بحث کر کے حدیث کا درجہ متعین کریں۔ فقہاء وہ ہیں جو صحیح احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ، ان سے مسائل کا استخراج کریں، خاص و عام حکم کی پہچان ہو اور ناسخ و منسوخ کا درک رکھتے ہوں۔ کتاب و سنت سے کسی مسئلے پر جب اپنا مذہب مرتب کریں تو دلائل و براہین سے اسے ثابت بھی کر سکیں۔

چنانچہ جو حدیث شیوخ سے مروی ہو اس کے مقابلے میں اس حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے جس کی روایت فقہا کریں۔ خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔ کہ حضرت وکیع نے حضرت علی بن خشرم سے پوچھا:

ای الاستاذ احب الیکم الاعمش عن ابی وائل عن عبداللہ او سفیان عن منصور عن ابراہیم عن عقلہ عن عبداللہ؟ ”فقلنا الاعمش عن ابی وائل۔“ فقال سبحان اللہ! الاعمش شیخ وابو وائل شیخ وسفیان فقیہ ومنصور فقیہ و ابراہیم فقیہ و علقہ فقیہ و حدیث تداولہ الفقہاء؟ خیر من ان یتداولہ الشیوخ۔

تمہیں کون سی سند زیادہ پسند ہے اعمش روایت کریں ابو وائل سے اور وہ عبداللہ (بن مسعود) سے یا سفیان حوالہ دیں منصور کا اور وہ ابراہیم کا اور وہ علقہ کا اور وہ

عبداللہ (بن مسعود) کا۔ ہم نے کہا اعمش کی جو روایت ابووائل کے ذریعے ہو۔
فرمایا سبحان اللہ! اعمش شیخ ہیں اور ابووائل شیخ ہیں۔ لیکن سفیان فقیہ ہیں، منصور
فقیہ ہیں، ابراہیم فقیہ ہیں اور علقمہ فقیہ ہیں جو حدیث فقہاء کے ہاں رائج ہو وہ اس
سے بہتر ہے جو شیوخ کے ذریعہ رواج پائے۔ [الکفایہ، ص ۴۳۶]

اعمش جس حدیث کی روایت ابووائل سے کریں اور وہ ابن مسعودؓ سے اس میں
واسطے کم ہوں گے اور ایسی حدیث کو ”عالی“ کہا جاتا ہے۔ محدثوں کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے
اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں ”عالی“ حدیث ملے۔ سفیان سے حضرت ابن مسعودؓ تک واسطے
زیادہ ہیں مگر اوویوں کے فقیہ ہونے کے سبب اسے ترجیح دی جائے گی کیونکہ اسے ان حضرات
نے روایت کیا ہے جو دین کے نکات پر عبور رکھتے ہیں۔

یہ کوچ (م ۱۹۸ھ) امام اعظم کے اجلہ تلامذہ میں ہیں اور امام اعظم، امام شافعی اور
حضرت امام احمد کے اجلہ اساتذہ ہیں۔ حدیث کے بارے میں ان کا بیان حجت مانا جاتا ہے۔
یہیں سے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کا طریقہ کار معلوم کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علم کے لیے کن
حضرات سے استفادہ انہیں عزیز تر تھا۔ حضرت امام کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے
لیکن استاذ اسے کہتے ہیں جس کی خدمت میں انسان ایک عرصے تک حاضر رہا ہو۔ کسی صنف علم
میں اس سے تربیت حاصل کی ہو اور خود جب درس دینے بیٹھے تو اس کے اقوال سے استشہاد کے
ساتھ اپنے اجتہاد کی قوت بھی اس کے مذہب سے ثابت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت امام کا عمومی رجحان
اپنے اساتذہ کرام کی طرح فقہ فاروقی اور علم ابن مسعود کی طرف ہونا چاہیے اور واقعی تھا بھی، جیسا
کہ ان کے اپنے بیانات اور ان کے مذہب سے عیاں ہے ایسا ہونے کی ایک وجہ اور بھی
تھی کہ انھوں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے خاص فیض اٹھایا تھا اور وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ
اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور یہ دونوں بزرگوار وہ ہیں جنہیں شرف
صحابیت کے ساتھ یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ فیوض فاروقی سے بہرہ وافر رکھنے کے سبب ان کا شمار

امت کے عظیم ترین فقہاء میں ہوا۔

اب بعض لوگ بیان کرتے ہیں اور بلا تحقیق بڑی تحدی سے کہ حضرت امام اعظم نے جناب محمد (الباقر) اور ان کے فرزند جعفر الصادق سے باقاعدہ تحصیل علم کی تھی اور ان دونوں کے علاوہ عبداللہ المحض اور زید بن علی بن الحسین سے بھی انہیں خاص فیض تھا۔ اسی لیے ان کے اندر شیعیت کی طرف میلان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بیان جس کسی کا بھی ہو از سر تا پا غلط ہے۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام بن تیمیہ فرماتے ہیں:

ان هذا امن الكذب الذي يعرفه من له ادنى علم فان اباحيفه من اقران جعفر الصادق، توفي الصادق سنة ثمان واربعين و توفي ابو حنيفه سنة خمسين ومائة و كان ابوحنيفة يفتى حيوة ابى جعفر والد الصادق وما يعرف ان باحنيفة اخذ عن جعفر الصادق ولا عن ابیه مسئله واحدة بل اخذ عن اسن منهما العطاء بن ابى رباح وشيخه الا صلى حماد بن ابى سليمان.

[یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم کا آدمی بھی جانتا ہے کیونکہ ابوحنیفہؒ تو جعفر الصادق کے ہم طبقہ ہیں۔ صادق کی رحلت ۱۲۸ھ کی ہے اور ابوحنیفہؒ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ ابوحنیفہؒ تو صادق کے والد ابو جعفر کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ ابوحنیفہؒ نے جعفر الصادق یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو بلکہ انہوں نے علم ان بزرگواروں سے حاصل کیا جو ان دونوں سے زیادہ معمر تھے جیسے عطاء بن ابی رباح اور ان کے اصل استاد امام حماد ابن ابی سلیمان۔]

رہی یہ بات کہ محمد الباقر عبداللہ المحض یا جعفر الصادق اور زید بن علی بن حسین وغیرہم سے ان کی صحبتیں رہی ہوں، علمی مذاکرات ہوئے ہوں تو کچھ بعید نہیں کیونکہ یہ حضرت مدینہ میں رہتے تھے اور امام اعظم جب حج کے موقع پر حرمین شریفین حاضر ہوئے ہوں گے تو ان سے

ملاقات بھی کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم بھی ہوتی ہوگی جو اصحاب علم کا شعار ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے کہ امام صاحب نے اپنے ان ہم عصر حضرات سے اخذ علم کیا اور اس تعلق سے انہیں شیعہ بتایا جائے۔

علاوہ ازیں دیکھنا چاہیے کہ علوی اکابر مدینے میں رہتے تھے۔ امام صاحب کا قیام مکہ معظمہ میں تو ثابت ہے مگر مدینے میں مستقل طور پر رہنا ثابت نہیں ہوتا لہذا بعض لوگوں کا یہ قول کہ زید بن علی بن الحسین سے امام صاحب نے باقاعدہ تحصیل علم کیا کسی طرح صحیح نہیں۔ اول تو اس لیے کہ جب امام صاحب نے ان کے برادر بزرگ محمد الباقر ہی سے اکتساب علم نہیں کیا تو ان سے کیا کرتے۔ پھر یہ ہے کہ جناب زید اگرچہ کچھ عرصے کو فنی میں رہے مگر یہ زمانہ ان کے سیاسی جوڑ توڑ کا تھا اور خلافت قائمہ کے خلاف وہ خفیہ ریشہ دوانیوں میں مشغول رہے۔ اس کا موقع ہی کہاں تھا کہ وہ علمی محفلیں منعقد کر سکیں اور لوگ طلب علم کے لیے ان کے پاس آئیں۔ امام اعظم اور ان کے اساتذہ کرام کے مسلک کے مطابق یہ مناسب بھی نہ تھا کہ وہ جناب زید کے پاس جا کر اپنی بیعت مشکوک بنالیں جو حسب فرمان نبوی کسی طرح جائز نہیں۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے النافع الکبیر لمن یطاح الجامع الکبیر میں رجال حنفیہ کے تحت (ص ۱۴، طبع مصطفائی) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مذکورہ بالا بیان کی تردید کی ہے اور مشکوٰۃ المصابیح کے مؤلف ولی الدین ابو عبد اللہ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے رجال مشکوٰۃ کے تراجم میں جعفر الصادق کی بابت لکھا ہے:

سمع منه الاثمة الاسلام الاعلام نحو یحیی بن سعید وابن جریج

ومالک بن انس والثوری وابن عیینہ وابو حنیفہ

[ان سے (یعنی صادق) سے اکابر ائمہ نے حدیث کی سماعت کی ہے مثلاً یحییٰ بن

سعید نے، ابن جریج نے مالک بن انس نے، سفیان ثوری نے، سفیان بن عیینہ

نے اور ابوحنیفہ نے۔]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ولی الدین دونوں آٹھویں صدی کے بزرگ ہیں۔ اگر بات

ان کے اپنے زمانے کی ہوتی تو ایک کا قول دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ گو پھر بھی قرائن سے وجہ ترجیح معلوم کی جاتی یہاں معاملہ ہے دوسری صدی ہجری کا اور اس کے لیے دلیل قریب العہد مصنف کے بیان سے لانی تھی۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام محقق ہیں اور ولی الدین محض ناقل۔ ظاہر ہے کہ ناقل کے مقابلے میں محقق کا قول قابل ترجیح ہے جب تک اس کے خلاف دلیل سامنے نہ آجائے۔ ولی الدین نے رجال کے تراجم میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ پانچویں، چھٹی صدی ہجری میں جو باتیں مشہور ہو چکی تھیں وہی لکھ دیں مثلاً حضرت سعید بن جبیرؒ اور امیر حجاج بن یوسف کے مابین جو لکھا ہے وہ خاصا افسانوی ہے۔ ایسے ہی امام اعظم کے متعلق وہی خرافات نقل کر دی ہیں کہ امیر ابن ہبیرہ اور امیر المومنین المنصور نے انہیں عہدہ قضا قبول کرنے پر قید و بند اور تازیانوں کی سزاسنادی اور محبس میں ان کی وفات ہوئی ایسے ہی متعدد رجال کے کوائف جو انہوں نے نقل کیے ہیں وہ اہل تحقیق کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

پھر دیکھنا چاہیے کہ شیخ الاسلام کی عبارت میں یہ کہاں ہے کہ امام اعظم اور جعفر الصادق کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ان سے انہوں نے کوئی حدیث ہی نہیں سنی اور ان کے مابین کبھی علمی مذاکرات ہی نہیں ہوئے۔ وہ تو یہ فرماتے ہیں کہ ”یہ بات جانی پہچانی نہیں کہ ابو حنیفہ نے جعفر الصادق یا ان کے والد ماجد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو“، یعنی انہوں نے اپنے فقہ کی تدوین میں فقہ جعفری سے کوئی مدد نہیں لی اور نہ اپنے دلائل میں انہوں نے اپنے دونوں بزرگواروں کے اقوال کو بطور حجت پیش کیا۔ امام صاحب نے سیکڑوں بزرگواروں سے روایات سنیں ایسے ہی جناب صادق اور جناب باقر سے بھی سنی ہوں گی۔ امام صاحب کو تو اپنے چھوٹوں سے کبھی عار نہ تھا اور یہ دونوں تو بلند پایہ تھے۔ یہاں سوال ان کی شخصیتوں کی بلندی اور ان سے استفادے کی اہلیت کا نہیں۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے ان سے استفادے کے ثبوت کا ہے۔ جو نہیں ملتا اور ملتا بھی کہاں سے کیونکہ جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب بوہیہ شیعہ حکومت نے پر پرزے نکالے اور اس فقہ کی باقاعدہ تدوین صفوی دور میں ہوئی۔

امام اعظم عراقی تھے اور گاہے بگاہے مختصر ساعات میں ان کی ملاقات جعفر الصادق سے ہوئی ہوگی لیکن امام مالک خاص مدینہ میں رہتے تھے اور شاید روزانہ ہی جناب صادق سے ملاقات ہوتی ہو، اب مؤطا شریف موجود ہے اس میں دیکھا جائے کہ جناب صادق سے کتنی روایتیں لی گئی ہیں۔ صرف معدودے چند۔ اس میں کثرت نظر آتی ہے مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کی اور یہ سلسلۃ الذہب کہلاتا ہے جو درجہ حضرت امام مالک کے ہاں اس سند کا ہے وہی درجہ امام اعظم کے ہاں ابوحنیفہ عن عطاء عن ابن عباسؓ کا ہے۔

علاوہ ازیں روایت لینا اور بات ہے اور اپنا مذہب متعین کرنا بالکل دوسری بات۔ چنانچہ جن حضرات کے ذریعے فقہ کی تعلیم عام ہوئی ان میں امام ابن قیم کے علم مدینہ کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام بتایا ہے۔ اہل مکہ کے لیے حضرت ابن عباسؓ کا اور اہل عراق کے لیے حضرت ابن مسعودؓ کا اس ذیل میں جناب جعفر الصادق کا نام نہیں ملتا وہ بھی منجملہ ہزار ہا علماء کے تھے، مگر جہاں تک ان سے علم حاصل کرنے کا سوال ہے تو ائمہ فقہ نے اس کے لیے توجہ دوسرے حضرات کی طرف کی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اخذ روایت اور تحصیل فقہ دو مختلف باتیں ہیں۔ فلاں نے فلاں سے روایت لی تو اس سلسلے میں بیسوں بلکہ سینکڑوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن جب کہا جاتا ہے فلاں تفقہ علی فلاں تو وہاں صرف دو تین ہی نام لیے جاتے ہیں۔ یعنی فلاں نے فلاں کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث و فقہ پر عبور حاصل کیا ہے، استاد ایسے ہی بزرگواروں کو کہا جاتا ہے نہ کہ ہر شخص کو جس سے کسی نے کوئی روایت لی ہو جناب محمد الباقرؑ نے تو امیر المومنین یزید کی والدہ ماجدہ سیدہ میسون سے روایت لی ہے تو کیا انہیں ان کا شاگرد کہا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ اور سیاسی ہنگامے

ائمہ فقہ وحدیث کے بارے میں عموماً اور ابوحنیفہ کے متعلق خصوصاً عجیب وغریب روایتیں وضع کی گئی ہیں یا تو ان کی علمی حیثیت گرانے کی غرض سے یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ شیعہ تھے یا شیعیت کی طرف مائل کیونکہ بقول رواۃ وہ ان طالبوں اور علویوں کے عقیدت مند تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف خروج اور بغاوتیں کیں۔

اہل تشیع کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد نزول قرآن کی غایت اور امت مسلمہ کی تشکیل سے غرض طرح طرح سے یہ بتائی گئی ہے کہ دنیا پر آل علی کے اقتدار کا پرچم لہرائے اور تاقیامت اسی خانوادے کے ہاتھ میں امت کی زمام کار رہے۔ باقی مسلمان ان کی تابعداری کے مکلف ہیں اور بس۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ آل علی کو سیاسی اقتدار نصیب ہوا اور نہ علمی حیثیت سے وہ ایسا مقام حاصل کر سکے کہ دوسروں کو چھوڑ کر لوگ تحصیل علم اور کتاب نور کے لیے محض ان کی طرف مائل ہوں اور انہی کے فیوض دنیا میں پھیلیں۔ یوں تو اس علوی خانوادے میں بھی بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں جن سے امت فیض لیتی چلی آرہی ہے مگر مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ان کی حیثیت منجملہ دیگر اکابر امت کے رہی۔ امت محمدیہ جیسی غیر طبقاتی امت میں پیدائشی بزرگی کا کیا تصور ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہی کیا گیا جو شکست خوردہ لوگوں کا طریقہ ہے کہ آل علی کے فضائل ومناقب کی موضوعات کے علاوہ ابوطالب تک کے اسلام اور روحانی برتری کے ثبوت کے لیے روایتوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا اور غلو میں نصاریٰ کو بھی مات

کردیا۔ نتیجے میں صحابہ کرام، خلفاء اسلام اور علماء و فقہاء امت پر طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ کے صحابہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے جن ہزار سے زیادہ کبار صحابہ ہیں ان کی حیثیت ثانوی اور غیر اہم بنادی گئی بلکہ ان کی تکفیر و تفسیق و ارتداد تک نوبت پہنچادی گئی۔ معارف قرآنیہ اور انوار نبوی کا گنجینہ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کو قرار دیا گیا اور اکابر صحابہ کی موجودگی میں ان کے سامنے ان طالبی اور علوی بچوں کو ان سے افضل و اقدس و انور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنہیں نہ تو نبی ﷺ کی صحبت کا شرف نصیب ہوا نہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے جان کی بازی لگانے کا اور نہ نشر و اشاعت دین کے لیے حلقائے درس قائم کا۔

لیکن یہ کام چل نہیں سکتا تھا جب کہ امت کے اکابر علماء فقہاء کو بھی کسی درجے میں اپنا ہم خیال ثابت نہ کر لیں تاکہ عوام کو ان روایات و ہدیہ سے متاثر کر کے سلف کرام سے بدظن کرنے کی مہم سر کی جائے اس غرض سے سب سے زیادہ توجہ امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف کی گئی کیونکہ وہ عجمی الاصل تھے اور کوئی ہونے کے سبب یہ بیان قرین عقل باور کرایا جاسکتا تھا کہ ان کی ہمدردیاں آل علیؑ کے ساتھ تھیں اور ان کے نزدیک خلافت قائمہ کے خلاف خروج کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

اس طرح خلفاء اسلام اور ان کے امراء کو جو سیاسیات اسلامیہ کی تشکیل و ارتقاء کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے تھے انہیں دنیا دار ٹھہرا کر ان کے اور ائمہ فقہ و حدیث کے مابین بغض و تنافر کی خود ساختہ روایات کو فروغ دیا گیا تھا نق بدیہ یہ کہ اس طرح دبا گیا کہ عام تعلیم یافتہ آدمی بہک جائے بشر و اشاعت کی اس کثرت کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ آج عالم یہ ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ ان خرافات کو واقعات سمجھ کر امت کے ائمہ و خلفاء کا تذکرہ ایسے کرتے ہیں جیسے وہ دشمنان ملت ہوں اور ان کی علمی و روحانی حیثیت بلند نہ ہو۔

امام صاحب کے زمانے میں آل علیؑ میں سے تین اہم شخصیتوں نے خروج کیے۔ یعنی زید بن علی بن الحسین، محمد الارقط بن عبد اللہ بن الحسن بن الحسن اور ان کے بھائی ابراہیم نے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امام کی ہمدردیاں ان تینوں کے ساتھ تھیں اور وہ اموی و عباسی خلفاء کو غاصب

خلافت اور نا اہل امامت سمجھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً صحیح صورت حال کیا ہے اور یہ کہ ایسا تصور کذب و افتراء تو نہیں۔ چنانچہ کتاب و سنت، مذہب امام، مواقف تلامذہ امام اور حقائق تاریخیہ سے تو یہ سب کچھ افتراء محض ہی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور زید بن علی بن حسین

زید جناب علی (زین العابدین) کے فرزند تھے۔ اپنے والد ماجد اور بردار بزرگ محمد (الباقر) کے برخلاف ان میں غیر معمولی ترفع نفس تھا اور یہ چاہتے تھے کہ ہم نسب اور ہم چشم لوگوں میں اپنا امتیاز قائم کریں، چنانچہ ان کی پہلی جھڑپ اپنے ابن عم عبداللہ المحض بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب سے ہوئی۔

خیبر اور ذک وغیرہ کا جو حصہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا خاص کر دیا گیا تھا اور اسے وقف کی صورت دے دی گئی تھی اس کے پہلے متولی حضرت صدیق اکبرؓ ہوئے پھر حضرت فاروق اعظمؓ فاروقی عہد میں یہ تولیت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سپرد کر دی گئی۔ عہد عثمانی میں حضرت عباسؓ کی وفات کے بعد اس کے متولی تنہا حضرت علیؓ رہے۔ آل عباسؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ ان سب کے بڑے بھائی تھے اور حق والوں کا حق ان کے ہاتھ میں محفوظ تھا۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے متولی حضرت حسنؓ ہوئے۔ ان کے بعد اس کی مشترکہ تولیت علیؓ بن الحسینؓ اور حسنؓ بن الحسنؓ کے سپرد ہوئی لیکن علی بن الحسین کے بعد اس کے تنہا متولی حسنؓ بن الحسنؓ رہ گئے اور ان کے بعد یہ تولیت ہاشمی خاندانی وقف کی ان کے فرزند ارجمند زید بن الحسنؓ بن الحسنؓ کو ملی (صحیح بخاری، کتاب المغازی حدیث بنی النضر) پھر ان زید کے بعد یہ تولیت ان کے بھائی عبداللہ المحضؓ کو ملی۔ اس طرح وقف کا انصرام آل حسن کے ہاتھ میں چلا گیا کسی حسینی یا عباسی کو اس پر اعتراض نہ ہوا کیونکہ یہ تولیت تھی اور ناجائز تصرف کا اس پر امکان نہ تھا۔ گویا پورے اموی دور میں اور ابتداء عباسی عہد تک خلفاء اسلام نے اسی حسنی خاندان میں اس

تولیت کا سلسلہ قائم رکھا۔ حضرت مروانؓ اور ان کی اولاد امجاد میں جو خلفاء ہوئے، ان کے بارے میں یہ جھوٹی روایتیں مشہور کی گئیں کہ انہوں نے اس جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے پھر حق داروں کو دے دیا تھا۔

زید بن علی بن حسین کو یہ صورت ناگوار تھی کہ حسینوں میں تولیت رہے وہ تو اس تولیت میں شرکت چاہتے تھے مگر عبداللہ الحنفیؒ نے تمام بنو ہاشم کی حمایت کے سبب اسے منظور نہ کیا۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا۔ حتیٰ کہ راویوں کے بقول جناب زید چونکہ کینز کے لطن سے تھے فریقین کے درمیان فتیح قسم کی بدکامی بھی ہوئی۔ پھر مقدمہ امیر مدینہ کے ہاں پیش ہوا۔ وہاں بھی دونوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا اور باہمی پست قسم کے طعنے دیے اس پر امیر مدینہ نے قریش اور انصار کا جرگہ طلب کر کے اس قضیے کا فیصلہ چاہا لیکن وہ فیصلہ جناب زید کے خلاف ہوا۔ انہوں نے اس کا مراجعہ امیر المومنین ہشام کے ہاں کیا مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ ایسا ہی ایک مالی جھگڑا ان کا امیر عمر بن امیر المومنین ولید سے ہوا اور اس معاملے میں بھی فیصلہ زید کے خلاف رہا۔ اسی قسم کے اور بھی معاملات یعنی زر، زمین کے جھگڑے تھے۔ ان سب میں امیر المومنین کے ہاں زید کے مطالبات کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ طبری نے اپنے تشیع کے باوجود کئی صفحوں پر یہ سب روایتیں تفصیلاً بیان کی ہیں انہیں پڑھ کر کوئی باوقار آدمی مکدر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ ہے کہ جناب زید کا کوئی معاملہ سیاسی، دینی یا نظریاتی نہ تھا صرف مالی تھا اور وہ بھی باہمی پست نزاع پر مبنی۔ طبری کی کسی روایت میں کوئی بات ایسی مذکور نہیں جس سے زید کے معاملات میں کوئی رفعت نظر نہ آئے لیکن اپنی ناکامی کے سبب وہ ایسے زچ ہوئے کہ جذبات میں ہيجان پیدا ہو گیا۔ کوفے کے سبائیوں نے ان کی نفسیاتی کیفیت بھانپ لی اور انہیں اپنے ہاں بلا کر بغاوت پر ابھارا۔ وہ خود بھی امیر المومنین سے اپنے غیظ و غضب میں یہ کہہ کر آئے تھے اخراج ثم لاترانی الا حیث تکرہ (میں جا تو رہا ہوں مگر مجھے آپ ایسی حالت میں پائیں گے کہ آپ کو ناگوار ہوگی) اسی لیے دمشق سے مدینہ واپس ہونے کے بجائے کوفہ پہنچ گئے تھے اور سبائیوں کے بھڑے میں آ کر خروج کر بیٹھے۔

مکران کی حسن تدبیر کا یہ عالم تھا کہ وقت پر دو سو آدمیوں سے زیادہ ان کے ساتھ نہ تھے۔ تین براعظموں میں جس اموی امام کا پرچم لہرا رہا تھا اور ہم عصر امت جسے ایک مثالی حکمران سمجھتی تھی اس کے مقابلے میں دو سو آدمیوں کا بغاوت کرنا سوائے فساد فی الارض کے اور کیا تھا۔ اب غور طلب بات ہے کہ شیخ ابو زہرہ جیسے فرزانہ شخص نے ہوا پرست راویوں کی یہ روایت قبول کر لی کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس خروج میں زید کی حمایت کی تھی اور اسے غزوہ بدر کے مماثل قرار دیا تھا مگر عملاً ساتھ دینے کے بجائے کچھ رقم امداد دے کر گھر میں بیٹھے رہے۔

جناب زید کا خروج ۱۲۰ھ کا ہے۔ یعنی اس وقت امام ابوحنیفہ مجتہد مطلق ہونے کے درجے پر نہ تھے، بلکہ ہزار باعلماء میں سے وہ بھی ایک عالم تھے جن کا نہ فتویٰ کوئی امتیازی درجہ رکھتا تھا اور نہ عمل، ان کے استاد امام حماد یا تو زندہ تھے یا انہیں وفات پائے اور امام صاحب کو ان کی مسند سنبھالے چند ہی دن ہوئے تھے کیونکہ امام حماد کی وفات بھی ۱۲۰ھ ہی کی ہے۔ امام صاحب کی اس وقت یہ حیثیت نہ تھی کہ اپنے شیخ کے موقف کے خلاف کوئی اقدام کریں کیونکہ اس طرح وہ حضرت حماد کے تلامذہ میں اپنا وقار کھو بیٹھتے اختلاف کرنے کا درجہ تو انہیں بہت بعد میں ملا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر بفرض محال امام صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کے موقف سے ہٹنے کی جرات کی اور مصمم قلب سے یہ جانا کہ زید حق پر ہیں ان کے خروج میں مصلحت ملتی ہے اور ان کا ساتھ دینا ایسا ہی ہے جیسے غزوہ بدر میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہو کر کفار سے نہر آ زما ہونا یعنی انہوں نے امت کے متفق علیہ امام ہشام امیر المومنین کو ابو جہل کی طرح سمجھا۔ ان کے اعوان و انصار اور علماء و فقہاء امت کے علاوہ جمہور بنی امیہ و بنو ہاشم کو کفار مکہ کی طرح جانا پھر ان کے مقابلے میں جناب زید کی شان سرور عالم ﷺ کی سی قرار دی اور ان کے نزدیک دو سو کوئی جو جناب زید کے ساتھ میدان میں آئے وہ رسول اللہ ﷺ کے ان ۳۱۳ جانباز ساتھیوں کا درجہ رکھتے تھے جنہوں نے بدر کے میدان میں کفر کا جھنڈا سرنگوں کیا تھا تو امام صاحب کو سو برس بعد باسانی شہداء بدر کا درجہ حاصل کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔

اگر ایک شخص کو اطمینان ہو کہ جان دے کر اللہ کے ہاں اس کا شمار بدر کے غازیوں

اور شہیدوں میں ہوگا تو اسے اس معرکے میں جناب زید کے پہلو بہ پہلو لڑنا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کچھ مال دے کر گھر میں بیٹھا رہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر جو بیعت امیر المؤمنین سے کی تھی اسے بھی توڑا اور حاصل یہ ہوا کہ نہ غازیوں میں رہے اور نہ شہیدوں میں۔ امام صاحب جیسے علم و اتقی کے متعلق ابو زہرہ اور دوسرے لوگوں کی بیان کردہ روایت ہیچ محض ہے اور کسی درجے میں اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ امام صاحب نے چونکہ زید کا ساتھ نہیں دیا اور نہ امیر کوفہ نے انہیں اس میں ملوث سمجھا۔ اس لیے یہ ناپاک روایت وضع کی گئی ہے کہ امام صاحب نے کچھ روپیہ دے کر ان کی خفیہ مدد کی تھی۔

ان راویوں کو جب اس خفیہ مدد کا علم ہے تو اموی گورنر امیر یوسف ابن عمر جیسے مدبر کو اس کا علم کیوں نہ ہو سکا، انہوں نے امام صاحب کو اعانت جرم کی سزا کیوں نہیں دی جب کہ اس وقت ان کی کوئی خاص نمایاں حیثیت بھی نہ تھی جو امیر کو ان کے قتل پر کسی فتنے کا خدشہ ہوتا کیونکہ زید سے اہم تو اس وقت ان کی شخصیت نہ تھی انہیں جب قتل کر دیا تو امام صاحب کو بھی کر سکتے تھے۔

جس شخص کو تمام امت کے فقہاء کا امام بننا تھا اگر اس کا کردار ایک معمولی صاحب عزیمت کا سا بھی نہ تھا کہ جس بات کو حق جانے اس کے لیے جان دے تو اس کی حیثیت یہ کب رہتی ہے کہ اس کے متعلق امام شافعی فرمائیں الناس عیال لابی حنیفہ فی الفقہ (لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے پروردہ ہیں) جناب زید کے خروج میں حضرت امام کی ہمدردی ان کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ امام صاحب کا اور ان کے اساتذہ کرام کا کھلا مذہب ہے۔ لانوری الخرو و ج علی ائمتنا و ولایۃ امورنا (ہم اپنے خلفاء اور اپنے امراء کے خلاف خروج کو ناجائز سمجھتے ہیں) سلطان ابوالمظفر عیسیٰ بن ایوب الملک المعظم نے انھیں المصیب فی الرد علی الخطیب میں حضرت امام کا یہ قول نقل کر کے آپ کا مفصل فتویٰ اس طرح بیان کیا ہے:

اذا سمع الامام ان قوما يدعون الى الخروج فعليه ان ينبذ اليهم
ویمسکهم حتی یمضوا واتوبہ. فاذا صار لهم فیئۃ یرجعون الیہا یقتل

مقاتلہم ویجہز جریحہم ویقتل اسرارہم کما یقتل الکفار۔

جب امام سنے کہ کچھ لوگ خروج کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کا عہد ان پر لوٹا دے (یعنی ان کے شہری حقوق منسوخ کر دے) اور انہیں قید کر لے تا آنکہ وہ توبہ کریں۔ اب اگر ان کا کوئی جتھا بن گیا ہو جو ان کی حمایت کرے تو ان میں سے جو لوگ مقابلے پر آئیں انہیں قتل کرے ان کے زخمیوں کو مار ڈالے اور ان میں سے جو گرفتار ہو جائیں انہیں ایسے ہی قتل کرے جیسے کافروں کو مارا جاتا ہے۔]

پھر سلطان موصوف فرماتے ہیں:

فمن یکون هذا رایہ کیف یری الخروج علی الائمة قال اللہ تعالیٰ
واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیہم علی سواء ان اللہ لایحب
الخائنین۔ وقال لایمضی قضاء قاضی اهل البغی ولا تقبل شہادتهم
[تو جس شخص کی رائے یہ ہو وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کس طرح جائز سمجھ سکتا
ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تمہیں کسی گروہ کی طرف سے خیانت کا خطرہ ہو تو ان کا
عہد ویسے ہی ان پر پھینک مارو۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔]

پھر حضرت امام فرماتے ہیں کہ باغیوں کے قاضی کا فیصلہ ناقابل تنفیذ ہے اور ان کے گواہوں کی گواہی ناقابل قبول ہے۔

یعنی باغیوں کے تسلط کے زمانے میں جو عدالتی فیصلے ہوئے ہوں وہ کالعدم قرار دیے جائیں گے اور ان کی سماعت دوبارہ ہوگی۔

سلطان ابوالمظفر الملک المعظم، سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کے بھائی تھے۔ ان کا گھرانہ شافعی تھا مگر یہ خود حنفی تھے اور اپنی عقیدت و محبت میں اتنے شدید کہ سوائے امام اعظم کے اور کسی کا قول نہیں لیتے تھے یعنی نہ صاحبین کا اور نہ ان کے تلامذہ میں سے کسی اور کا۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام اعظم کے متعلق بہت واپسی روایتیں لکھ دی ہیں۔ الملک المعظم نے السہم المصیب میں ان پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ رسالہ مصر و ہندوستان سے شائع ہو چکا ہے۔

ہمارے سامنے دیوبند کا مطبوعہ رسالہ ہے، سلطان موصوف نے جب یہ رسالہ لکھا تو اس وقت آپ نصاریٰ سے برسرِ پیکار تھے اور نابلس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ استحضار علمی اور طمانیت قلب کی یہ شان تھی کہ اسی عالم میں یہ رسالہ لکھا۔ حالانکہ کتابیں ساتھ نہ تھیں جیسا کہ خود اس رسالے میں بیان کیا ہے۔ ایسے جامع الصفات ہوا کرتے تھے ہمارے حکمران۔ جب ہی تو اس دنیا کو نور و حکمت سے بھر دیا اور تہذیب و تمدن کے اس درجے تک امت کو پہنچا دیا کہ اہل عالم کے لیے نمونہ بنی۔

خلفاء اسلام کے خلاف خروج کے بارے میں سلطان موصوف نے امام صاحب کا فتویٰ نقل کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ و امام جماعت کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص سے امام ابوحنیفہؒ کو ہمدردی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ فتویٰ کتاب وسنت کے صریح نصوص پر مبنی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

من خلع یداً من طاعة لقی اللہ یوم القيمة لاحجة له ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاهلیة.

[جس نے خلیفہ وقت کی بیعت سے ہاتھ کھینچا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسا جائے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جو شخص ایسی حالت میں مرا کہ (خلیفہ اسلام کی) بیعت اس کی گردن میں نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔]

فقہ کے چاروں ائمہ اس بارے میں متفق ہیں اور احکام خداوندی کے مطابق ان کا فتویٰ ایک ہی ہے۔ ”حیات احمد بن حنبل“ سے حضرت امام احمد کا وہ فتویٰ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس کی روایت امام جوزی نے کی ہے جو اخذ روایت میں انتہا درجے کے سخت تھے۔ وہ فتویٰ یہ ہے:

”امام وقت اور خلیفہ قائم کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ فاسق و فاجر ہو یا نیکو کار اور پرہیزگار۔ وہ جب مسند خلافت پر اس طرح متمکن ہو کہ لوگ اس کی امامت پر جمع ہو گئے ہوں اور اس سے راضی ہوں یا وہ بزورِ شمشیر خلیفہ بنا ہو اور سب لوگ اسے امیر المومنین کہنے لگے ہوں تو کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان ائمہ

و خلفاء پر طعن کرے۔..... جس شخص نے ایسے امام المسلمین کے خلاف خروج کیا جس پر لوگ اجماع کر چکے ہوں اور اس کی خلافت مانتے ہوں خواہ یہ اقرار برضا و رغبت ہو یا بہ جبر واکرہ تو اس (خروج کرنے والے) نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے آثار کے خلاف کیا اور اگر وہ اس خروج کی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔“

چنانچہ یہی ارشاد نبوی میں ہے:

عن زیاد بن علاقہ قال سمعت عرفجہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول سنكون هناة وهناة فمن اراد ان يفرق امر هذه الامة وهي جميع فاقتلوه كائنا من كان.

[حضرت زیاد بن علاقہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے (حضرت) عرفجہ کو فرماتے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ عنقریب فتنے پر فتنے برپا ہوں گے تو جو شخص امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے اس حالت میں کہ امت متفق ہو چکی ہو تو ایسے شخص کو قتل کر دو اگرچہ وہ کوئی ہو۔] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۳۶، طبع مصر)

یہ ہے اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت، صحابہ کرامؓ کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا متفق علیہ فتویٰ۔ تو ایسی صورت میں اس کا قطعاً امکان نہ تھا کہ امام اعظم کو جناب زید یا بعد میں خروج کرنے والے شخص سے شتمہ برابر بھی ہمدردی ہو یا وہ اس خروج و بغاوت کو کسی درجے میں جائز سمجھتے ہوں چہ جائیکہ اسے جہاد کہیں اور غزوہ بدر کے مماثل بتا کر معاذ اللہ زندقہ و الحاد میں مبتلا ہوں۔

جناب زید کا شمار علماء بنی ہاشم میں ہے۔ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے اس لیے رجمان اعتراض کی طرف تھا۔ ان کے متبع نہیں امام کہتے ہیں اور ان کی اس فقہ پر اپنے علم و عمل کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن ان کے ہاں امام کا مفہوم وہ نہیں جو اثناعشریہ کے ہاں ہے نہ وہ انہیں خدا کی

طرف سے مقرر شدہ کہتے ہیں اور نہ معصوم جانتے ہیں۔ ان کے ہاں امامت کا مفہوم دینی اور سیاسی سربراہی سے ہے۔ ان کے گروہ کی حیثیت پھر بھی جماعت کے مقابلے میں ایک فرقے کی سی ہوگئی اگرچہ وہ اپنے عقائد و اعمال میں جماعت سے بہت قریب ہیں یہ اور بات ہے کہ ضعیف اور بعض بے پایہ احادیث جو انہیں اپنے ان زیدی ائمہ سے ملیں انہی پر ان کا مدار ہے اگر جناب زید نے دوست دشمن کی تمیز کی ہوتی، غدار کوئی سبائیوں کے بہکائے میں نہ آتے اپنے والد ماجد اور بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور عدالتی فیصلے خوش دلی سے قبول کر لیتے تو یہ زیدی فرقہ نہ بنتا۔ زیادہ سے زیادہ حنفی، شافعی مذہبوں کی طرح ان کا بھی ایک فقہی مکتبہ فکر بن جاتا اور ان کا شمار علماء سنت میں ہوتا یعنی ان کے خروج کے سبب ان کے فرقے میں جو مبتدعانہ خیالات آگئے اور جماعت کے مسلک سے وہ یک گونہ باہر ہو گئے یہ بات نہ ہوتی۔

علم تاریخ اور علم سیاست کا غیر جانبدار طالب علم ان کے اقدام کو کسی طرح تعمیری نہیں کہہ سکتا۔ علامہ شبلی نے بھی دے الفاظ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ امت کے متفق علیہ خلیفہ اور عظیم الشان امام ہشام امیر المومنین کے متعلق ان کا مخصوص گستاخانہ لہجہ اپنی جگہ ہے۔ فرماتے ہیں:

”جس قدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا (یعنی امام ابوحنیفہ کا جناب زید کی مدد کرنا۔ ع) لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حالت میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔“ (سیرۃ النعمان، ص ۴، طبع دیوبند)

لوگوں نے جو ہوا باندھی ہے کہ اہل کوفہ میں سے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے جناب زید سے بیعت کر لی تھی اور ایک لاکھ آدمی ساتھ دینے کو تیار تھے اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا امکان تھا۔ اوّل تو اس لیے کہ امیر یوسف عمر جیسے جہاں دیدہ اور بیدار مغز والی کی نگاہ سے اختلاف کی یہ صورت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی اور دوسرے صراحتاً جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ دوسو

سے زیادہ آدمی جناب زید کے ساتھ نہ تھے۔ فوج سے ان کا کوئی باقاعدہ مقابلہ نہیں ہوا۔ معمولی شورش تھی جو اچانک نمودار ہوئی اور زید کے کام آجانے پر ختم ہو گئی۔

انتباہ

امام اعظم نے باغیوں کے متعلق جو فتویٰ دیا ہے وہ بظاہر بہت سخت معلوم ہوتا ہے کیونکہ کافروں اور باغیوں کے ساتھ مسلمانوں کا یہ طرز عمل کبھی نہیں رہا کہ زغیوں اور اسیروں کو قتل کر دیا جائے تاریخ اس پر شاہد ہے اور اس پر مثالیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ امر بدیہی ہے ہمارے خلفاء اور ان کے تحت وہ سلاطین جو اسلام کے نمائندے تھے انہوں نے نہ کبھی کسی بستی میں قتل عام کرایا نہ اسیران جنگ کو لازماً قتل کیا اور نہ زغیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ انہوں نے کسی بستی کو یا کھیتوں کو یا باغوں کو کبھی نہیں اجازت اور نہ مواشی کو ضائع کیا۔

لیکن امام اعظم رہتے تھے کوفے میں اور انہیں سبائی عزائم معلوم تھے یعنی یہ کہ ان کا مقصد محض سیاسی اختلال پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ نفس دین کو غارت کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ نے یہ سخت فتویٰ دیا اور یہ فرق ہمیں حضرت علیؓ کے عمل سے بخوبی معلوم ہو جاتا۔ اصحاب جمل و صفین سے آپ نے قتال کیا جس کی نوبت سبائیوں کی تخریبی کاروائیوں کے سبب آئی لیکن جمل میں فتح پانے کے بعد آپ نے اعلان کر دیا کہ نہ کسی فرار ہونے والے کا پیچھا کیا جائے اور نہ کسی زخمی کو مارا جائے (امام شافعی الام، ج ۴، ص ۲۱۶، طبع مصر) ان کا مال بھی نہیں لوٹا گیا۔ مورخوں کے بیان کے مطابق ان کا جو مال سبائیوں نے لوٹ لیا تھا وہ سب ان سے لے کر بصرے کی جامع مسجد میں جمع کر دیا کہ جس کا ہولے جائے۔ اسی طرح صفین میں ایک اسیر آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے رہا کر دیا اور فرمایا ”میں اللہ سے ڈرتا ہوں میں تمہیں قتل نہیں کروں گا“ (ہمیں کتاب، ص ۲۲۲)

امام اعظم کے سامنے خروج کرنے والے سبائی تھے جن کے عزائم کی زد میں نفس دین تھا اس لیے آپ کا فتویٰ اتنا سخت ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ خود امیر المومنین ہشام نے شورش

رفع کرنے کے لیے امیر کوفہ کو جو فرمان بھیجا تھا وہ بہت نرم تھا یعنی حسب بیان طبری آپ کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

”میں نے دیکھا کہ زید ایک جھگڑالو، چرب زبان اور تقریر میں رنگ آمیزی کرنے والے شخص ہیں انہیں کوفہ میں ٹھہرنے نہ دیا جائے کیونکہ وہ لوگوں کو گمراہ کر دیں گے انہیں نکال دو کہ سب کی سلامتی رہے اور کسی کا خون نہ بہے۔ میں تفرقہ کے مقابلے میں امن پسند کرتا ہوں۔ جماعت اللہ کی مضبوط رسی ہوتی ہے اور اگر تم سے ان کا تصادم ہی ہو جائے تو تم کو اللہ کی مدد اس وقت ملے گی جب تم اول اپنی حجت پوری کر دو گے۔ جنگ کے بعد ان لوگوں کے اہل و عیال سے کچھ تعرض نہ کرنا اور فوج کو حکم دینا کہ ان کے گھروں میں داخل نہ ہونے پائے امیر المؤمنین کا طرز عمل اپنی قوم کو مہالک سے بچانے راہ راست پر لانے اور سیدھے راستے پر چلانے میں شفیق والد کی طرح ہے جو اپنی اولاد کو ہر خطرے سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔“

اس فرمان کا نتیجہ تھا کہ معمولی جھڑپ کے علاوہ کچھ نہ ہوا۔ جناب زید کا سر کٹوانا، جُشہ سولی پر لٹکانا، اس پر تازیانے برسانا اور پھر ایک گڑھے میں پھینک دینا وہ خرافات ہیں جو ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لیے سبائی راویوں نے وضع کر کے ”زید شہید“ کا لقب دیا ہے۔ جناب زید سے امیر المؤمنین ہشام کے گونا گوں نسبی اور نسبی رشتے تھے ایسی صورت میں ان راویوں کی مکروہ باتیں ہرگز قابل اعتنا نہیں۔ اگر ایسے قریب ترین رشتے نہ ہوتے تب بھی ان بہیمانہ حرکتوں کا امکان نہ تھا جو تمام بنو ہاشم کو امیر المؤمنین سے برگشتہ کر دیں اور عام مسلمان بھی برا فروختہ ہو جائیں۔ زید کے اس سانچے پر عالم اسلام میں کوئی ہیجان نہ ہونا اس کی بین دلیل ہی ہے کہ ہم عصر امت کے نزدیک کوئی کام شریعت اور اخلاق فاضلہ کے خلاف نہیں ہوا اور اس کی بھی دلیل ہے کہ جناب زید کے خروج کو جائز نہیں سمجھا گیا۔ چہ جائیکہ حضرت امام اعظم کی ہمدردی ان کے ناجائز فعل سے ہو۔

امام ابوحنیفہ اور امیر ابن ہبیرہ

امیر یزید بن عمر جو ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور ہیں اموی عہد کے آخری والی کوفہ تھے جنہیں امیر العراقین کہا گیا انہی کے زمانے میں انقلاب آیا اور خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ ولی عہد خلافت حضرت ابو جعفر المنصور عباسی نے انہیں امان دی تھی لیکن ابو مسلم خراسانی جو عربوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے تہمید اور سرکشی کے سبب یہ امان منسوخ کر دی اور امیر ابن ہبیرہ پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ عباسیوں کے بجائے علویوں کی خلافت کے خواہاں ہیں انہیں شہید کر دیا۔ امیر المومنین المنصور جب خود سر پر آرائے خلافت ہوئے تو جن وجوہ کی بنا پر ابو مسلم قتل کیا گیا ان میں علاوہ دوسری سخت تر باتوں کے امیر ابن ہبیرہ کا خون ناحق بھی تھا۔

بہر حال چونکہ عراق میں عباسیوں کے داعیوں کا زور بڑھ رہا تھا اور حالات سے انتشار و اختلال کے خطرات اموی حکومت میں پیدا ہو رہے تھے اس لیے امام ابوحنیفہ حجاز چلے گئے اور قنفذہ فرو ہونے تک وہیں رہے۔ آپ مکے سے کوفہ اس وقت آئے جب خلافت عباسیہ قائم ہو گئی۔ حضرت امام کا اس طرح کوفہ چھوڑ دینا لوگوں کے لیے بہانہ بن گیا اور ایسی ایسی روایتیں وضع کیں جن کا بطلان عیاں ہے۔ تعجب ان مناقب نویسوں پر ہوتا ہے جنہوں نے عرصہ دراز کے بعد یہ مفتریات اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اس بین تضاد کا بھی خیال نہیں کیا جو ایسی ہر روایت میں عیاناً موجود ہے اور نہ یہ دیکھا کہ جس امام کی وہ بات کر رہے ہیں اس کے اپنے موافق کیا ہیں اور اس نے کن امور کی تعلیم دی ہے۔

کبھی آپ کی علمی قابلیت دکھانے کے لیے کہتے ہیں کہ خوارج (یعنی اس وقت کے سیاسی ہنگامہ آرائی کرنے والوں) کی اصلاح کے لیے امیر ابن ہبیرہ نے امام ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ سے ایک رسالہ لکھوایا لیکن عرصہ دراز کے بعد وہ جو کچھ لکھ کر لائے اسے امیر نے پسند نہیں کیا۔ کسی شخص نے کہا یہاں کوفہ میں ایک صاحب ہیں ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، وہ ایسا رسالہ لکھ سکیں گے۔ امیر نے آپ کو طلب کر کے ان صاحبوں کا نوشتہ دکھایا تو امام نے فرمایا

اس میں اللہ اور رسول کے علاوہ سب غلط ہے۔ پھر قلم برداشتہ ایسا مقالہ لکھ دیا جو امیر کو پسند آ گیا۔ گویا جو شخص خاص کوفے میں امام حماد کی مسند پر بیٹھا ہے اور اس کا وہاں عظیم الشان حلقہ درس ہے اسے امیر جانتے نہ تھے اور اس کے تعارف کی ضرورت تھی۔ راوی کا مقصد محض قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ کی تنقیص ہے کہ وہ ایک معمولی رسالہ بھی نہ لکھ سکے۔ پھر راوی کہتا ہے کہ امام صاحب شورش پسندوں سے نالاں تھے اور حکومت قائمہ سے وفاداری ایسی ضروری جانتے تھے کہ فوراً اس کی تائید میں ایک مسکت رسالہ لکھ دیا۔

اب دوسری روایت کے مطابق اموی حکومت کے امیر نے سیاسی اختلال کے سبب چاہا کہ ایک ”محب اہل بیت“ عالم کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی حکومت مضبوط کریں۔ چنانچہ امام صاحب کو قاضی بنانا چاہا اور بعض کے نزدیک اینٹیں گننے کا کام ان کے سپرد کرنا چاہا تو امام صاحب نے ”مخالفت حکومت“ ہونے کے سبب انکار کر دیا۔ اس پر امیر نے انہیں قید کر کے روز آ نہ کوڑے لگوائے تا آنکہ علماء و فقہاء نے آ کر فریاد کی کہ اگر اس شخص کو رہا نہ کیا گیا تو یہ مرجائے گا۔ امیر نے کہا کہ کوئی آدمی اسے سمجھائے کہ مجھ سے کچھ مہلت لے تا کہ میں اسے چھوڑ دوں امام صاحب نے مہلت مانگی جو دے دی گئی تو چپکے سے مکے فرار ہو گئے۔ یعنی یا تو حالت اتنی ستفیم تھی کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے یا چانک اتنی طاقت آ گئی کہ اونٹ پر بیٹھ کر سیکڑوں میل کا سفر کر ڈالا۔ پھر ایک طرف تو حکومت کے ایسے وفادار تھے کہ جھٹ اس کی حمایت میں رسالہ لکھ دیا، یا ایسے مخالف ہو گئے کہ حکومت کا عہدہ قبول کرنے کے بجائے قید و بند اور کوڑوں کی سزا کو ترجیح دی۔

ایک طرف آپ کا یہ مقام بتایا جاتا ہے کہ اموی حکومت کا ساتھ دیتے تو کوفے میں امن ہو جاتا اور آپ کے ذریعے اختلال سے نجات ملتی یعنی شہر میں آپ کی ایسی اہمیت تھی کہ امیر آپ کی اعانت کے محتاج تھے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ آپ اتنے بے حیثیت تھے کہ قید میں رہے کوڑے کھائے اور اہل شہر نے اس کی پروا بھی نہ کی اور سب ایسے ہو گئے جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ یعنی امام کی شہرت اور مقبولیت بھی ہے اور لوگوں کی ان سے بے تعلق بھی۔ وہ ایک

طرف محب اہل بیت ہیں کہ عباسی داعیوں کو رام کر سکیں اور حکومت کے ایسے طرف دار بھی کہ عباسی داعیوں سے برگشتہ کرنے کے لیے رسالہ بھی لکھ دیا۔

یہ سب متضاد اور پادور ہوا باتیں محض یہ بہتان رکھنے کے لیے وضع کی گئیں کہ امام صاحب کو خلافت قائمہ کا مخالف ثابت کریں یعنی امویوں کا جن کی حکومت قائم تھی اور عباسیوں کا بھی جن کی حکومت قائم ہونے والی تھی حالانکہ سیدھی سچی بات ہے کہ آپ چونکہ خالص علمی آدمی تھے اور غیر سیاسی زندگی کے خوگر۔ اس لیے عراق کی مکدر فضا دیکھ کر مکہ معظمہ چلے گئے ۲۰ حالانکہ نہ امیر اور ان کے درمیان کوئی مخالفت تھی اور نہ عباسی داعیوں سے کوئی ربط یا اختلاف تھا۔ رسالہ لکھوانے، قاضی بنانے کی پیش کش کرنے اور نہ ماننے پر قید و بند کی مصیبت میں مبتلا کرنے کی سب داستانیں بے حقیقت ہیں ان روایتوں کا تضاد ہی ان کے کذب و زور ہونے کی بن دلیل ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ نے امام صاحب کو سمجھایا تھا کہ جس طرح ہم نے امیر کے مجبور کرنے پر حکومت کے مناصب قبول کر لیے ہیں اسی طرح آپ بھی ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے امیر کی بات مان لیجیے اس پر امام نے فرمایا یہ شخص اگر مجھ سے واسطہ کی مسجد کے ستون گننے کو کہے گا تب بھی میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ یعنی ہیں تو کونے میں اور ذکر کر رہے ہیں واسطہ کی مسجد کا جیسے کونے کی کسی مسجد میں ستون ہی نہ تھے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ امیر ابن ہبیرہ کی ولایت سے پہلے سے محکمہ قضاء سے وابستہ چلے آتے تھے نہ کچھ جبر تھا اور نہ تقیہ۔ بلکہ قواعد دینیہ کے تحت خلافت قائمہ سے وابستگی کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے یہ حضرات مناصب پر فائز ہوئے اور عملی روحانی فرائض ادا کرنے کے سبب عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے تاکہ اگر کوئی سیاسی فتنہ اٹھے تو عوام کے حقوق محفوظ رہیں اور نا اہل لوگوں کا تصرف عدلیہ پر نہ ہو سکے اور سیاسی اختلا ل سے قانون کی حکمرانی پر کچھ برا اثر نہ پڑنے پائے چونکہ ہر اسلامی حکومت میں عدلیہ ایک خود مختار ادارہ ہوتا ہے اس لیے حکومت کے رد و بدل سے عدلیہ پر کبھی آنچ نہ آئی۔

طبری نے ۱۲۰ھ کے احوال کے تحت صراحت کی ہے وعلی قضاء الکوفۃ ابن شبرمۃ (کوفہ کے قاضی ابن شبرمہ تھے) پھر ۱۲۱ھ کے تحت کہتے ہیں وعلی قضاء الکوفۃ ابن شبرمۃ (کوفہ کے قاضی ابن شبرمہ تھے) اس کے بعد ۱۲۲ھ کے احوال بتاتے ہیں قاضی الکوفۃ فی هذه السنة محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ (اس سال کوفہ کے قاضی محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ تھے) یہاں سے یہ بھی عیاں ہوا کہ جناب زید کے خروج کے وقت یہ دونوں بزرگوار کوفہ میں موجود تھے اور انہوں نے اس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

امام ابن قتیبہ نے صراحت کی ہے۔ (المعارف، ص ۲۱۶)

وکان محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ ولی القضاء لبنی امیۃ ثم ولیہ لبنی العباس وکان فقیہا مفتیا بالرای۔

[محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ بنو امیہ کے زمانے میں عہدہ قضا پر فائز رہے پھر اسی عہدے پر بنو عباس کے زمانے میں بھی رہے۔ وہ فقیہ تھے اور اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے]۔ (یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کا مذہب ایک تھا۔)

ہمارے علماء و فقہاء کا یہ دستور تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ وہ غیر سیاسی زندگی بسر کرتے تھے اور جانتے تھے کہ قواعد شرعیہ کے مطابق امام جماعت سے وابستگی اور اس کے ساتھ تعاون لازم ہے۔ جن حضرات نے کسی عذر کے سبب یا اپنی کمزوری دیکھ کر حکومت کا عہدہ قبول نہیں کیا یا اپنی علمی شان کے خلاف جانا یا دنیوی مصالح سے بے نیاز رہے اور زاہدانہ زندگی بسر کی وہ بھی سب کے سب بالا استثناء جماعت کی بیعت پر استقامت کو فریضہ ملیہ سمجھتے تھے ان کا انکار حکومت کی تحقیر یا اس سے بے تعلقی کے سبب نہ تھا اور نہ اس لیے تھا کہ ان کی نگاہوں میں خلافت قائمہ کی حیثیت آئینی نہ تھی۔

اس زمانے میں ہر بالغ شخص امام وقت سے بیعت کرتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی یہ بیعت لی جاتی تھی کہ ہر شخص اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جماعت اور امام سے وابستہ رکھ کر وحدت امت کا تصور دل میں جاگزین رکھے محض مرکز کی طرف سے اعلان پر اکتفا

نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ بیعت خدا اور رسول کی سنت پر لی جاتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ہمارے علماء و فقہاء و ائمہ جو بیعت خدا اور رسول کے نام پر کریں وہ رکھی ہو اور منافقت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام ان کی زبان پر آئے۔

خلافت قائمہ اور علماء و فقہاء امت کے مابین دوئی یا حریفانہ چشمک ثابت کرنے کے لیے جتنی روایتیں وضع کی گئی ہیں وہ سب ملت اسلامیہ کے اندرونی دشمنوں کی ساختہ پرداختہ ہیں اور بے احتیاط لوگوں نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کر دیا کبھی عدم مبالاۃ کے سبب اور کبھی بالقصد تخریبی مقاصد کے تحت تاکہ اصحاب رسول اللہ ﷺ نے جو سیاسی نظام اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اس کی حجت مسلم نہ رہے۔

انسانی معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں خصوصاً جب وہ معاشرہ اتنا وسیع ہو کہ اس کی پہنائی میں کئی براعظم ہوں تو علماء و فقہاء کا ایک گروہ ایسا رہنا چاہیے جو حکومت کے مناصب سے الگ رہے تاکہ ہر قسم کے لوگ ان سے بے تکلف استفادہ کر سکیں اور یوں امت میں اصلاح اور یک جہتی کی فضا قائم رکھنے کی سبیل ہمیشہ کھلی رہے۔ اسی لیے ہمارے بہت سے اکابر نے اپنے آپ کو حکومت کے مناصب سے الگ رکھا اور چونکہ علماء و فقہاء کا یہ بھی فرض ہے کہ امت کو غلط روی سے محفوظ رکھیں اور قانون کی حکمرانی پر حرف نہ آنے دیں اس لیے بہ کثرت حضرات نے حکومت کے مناصب لیے اور امت نے ان دونوں طبقتوں سے پورا فائدہ اٹھایا یوں ثقافت اسلامیہ اس سنام اعلیٰ تک پہنچی جس نے اہل عالم کو شہر کر دیا۔

امام ابوحنیفہؒ اور امیر حسن بن قطیبہ

۱۳۲ھ-۱۳۳ھ میں انقلاب حکومت کے بعد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے سے کوئی تشریف لائے اور ۱۴۵ھ تک اپنے تدریسی اور تجارتی مشاغل میں مصروف رہے۔ پھر اسی سال دار الخلافہ کی تعمیر کے سلسلے میں بغداد تشریف لے گئے۔ ۱۵۰ھ تک قیام وہیں رہا۔ اسی سال آپ نے وفات پائی اور خانوادہ خلافت کے قبرستان میں دفن ہوئے جو بعد میں مقابر

خیز ران کے نام سے مشہور ہوا۔

بہر حال یہ تو تھی امام صاحب کی بات، اب امیر المومنین المنصور کے ایک سپہ سالار اور دعوت کے مخلص کارکن امیر حسن بن قطبہ کی بات ملاحظہ ہو۔ وہ اپنے والد ماجد امیر قطبہ کی معیت میں ۱۳۲ھ سے بھی پہلے سے دور دراز علاقوں میں خلافت اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے تھے اور ۱۳۶ھ سے لے کر ۱۶۸ھ تک شام اور آرمینا کی گونا گوں مہمیں سر کرنے میں مشغول رہے لیکن ہم یہاں اسی وضعی داستان پر توجہ کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ اور امیر حسن بن قطبہ کی بابت بڑی آب و تاب سے بیان کی جاتی ہے اور بعض مدعیان تحقیق نے اسے اہمیت دی ہے خلاصہ یہ ہے:

”امیر المومنین المنصور کے مظالم میں ان کا ساتھ دے کر حسن بن قطبہ نے جو گناہ سمیٹے تھے۔ ان کا بوجھ اپنے ضمیر پر محسوس کر کے انہوں نے امام حنیفہ کے ہاتھ پر توبہ کی لیکن امام نے فرمایا کہ تمہیں اپنی توبہ کا حقیقی ثبوت ابھی دینا ہے چنانچہ جب ۱۴۵ھ میں نفس زکیہ (محمد حسنی) کے خلاف المنصور نے حسن بن قطبہ کو لشکر لے جانے کا حکم دیا تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اپنی توبہ کے واقعی ہونے کا ثبوت تمہیں دینے کا وقت اب آیا ہے۔ وہاں جانے سے انکار کر دو اور اس خون ناحق میں اپنے ہاتھ مت رگو۔ ابن قطبہ نے ایسا ہی کیا اور قید کر دیے گئے۔“

جس شخص نے یہ افسانہ گھڑا ہے اسے اطمینان تھا کہ تاریخ کے اوراق پر کون نگاہ ڈالتا ہے اور واقعی وہ اپنے گمان میں سچا تھا کیونکہ لوگ اس افسانے کو اچھا لکھ کر حضرت امام کی شیعیت یا شیعیت کی طرف میلان کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے کے بزعیم خویش ایک بہت بڑے مفکر اسلام نے اپنی رسوائے عالم کتاب خلافت و مملوکیست میں پوری تفصیل سے اسے حجت بنایا ہے اور بار بار محمد حسنی کو نفس زکیہ کہہ کر حضور اکرم ﷺ پر جھوٹ بولا ہے کہ آپ نے محمد حسنی کو ان کے مقتول ہونے سے سو سو برس پہلے ہی نماز جنازہ پڑھ کر انفس الزکیہ فرمایا تھا۔

مگر صحیح صورت حال یہ ہے کہ نہ کبھی امام صاحب اور امیر حسن قحطہ یکجا ہوئے نہ انہیں محمد حسنی کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا گیا اور نہ اس کا امکان تھا کہ ۱۴۵ھ میں امام صاحب کسی سے اس کی توبہ کی واقعیت کا ثبوت طلب کرنے کے لیے اسے محمد حسنی کے مقابلے پر جانے سے روکیں کیونکہ امام صاحب اس وقت بغداد میں تھے نہ کہ کوفہ میں اور امیر المؤمنین کے حضور ان کی خدمت انجام دینے میں مشغول تھے نہ کہ ان کے خلاف کسی سیاسی جوڑ توڑ میں اور امیر حسن بن قحطہ بھی اس وقت بغداد و کوفہ سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

محمد حسنی کے خلاف جو فوجی دستہ بھیجا گیا تھا وہ تادیبی مقصد سے تھانڈے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا اسی لیے امیر المؤمنین نے اس کی کمان کسی غیر ہاشمی کو نہیں دی بلکہ اپنے سگے بھتیجے کے سپرد کی اور ہاشمی سادات کا ایک گروہ ان کے ساتھ کر دیا تاکہ جہاں تک ممکن ہو خون خرابے کی نوبت نہ آئے اور اپنے خاندان کے افراد کے سمجھانے سے وہ راہ راست پر آجائیں۔ کسی غیر ہاشمی کی کمان میں یہ دستہ بھیجنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا اور نہ یہ مہم ایسی تھی کہ امیر حسن بن قحطہ کو سیکڑوں میل دور کے علاقے سے طلب کر کے وہاں بھیجنا ضروری ہوتا۔

طبری کا بیان بذیل وقائع ۱۴۵ھ۔ ۱۵۰ھ اور اس کی توثیق دوسرے مورخوں کے علاوہ یا قوت جموی کے بیان سے بھی ہوئی ہے جو انہوں نے تعمیر بغداد کے سلسلے میں لکھا ہے:

ان لمنصور وجه في حشير الصناع والفعلة من الشام والموصل
والجبل والكوفة وواسط والبصرة فاحضروا وامر باختيار قوم من
ذوى الفضل والعدالة والفقہ و الامانة والمعرفة بالهندسية فكان
ممن حضر لذلك الحجاج بن ارطاة وابو حنيفة النعمان بن ثابت
وامر بخطط المدينة وحفر الاساسات وضرب اللين وطبخ الاجر
فبدى ذلك. واول ما ابتدى به في عملها ۱۴۵ھ.

۱ (امیر المؤمنین) المنصور نے حکم دیا کہ کاریگروں اور مستریوں کو شام، موصل،

جبال، کوفہ، واسط اور یسرے سے جمع کیا جائے چنانچہ یہ لوگ حاضر کر دیے گئے ایسے لوگوں کو متعین کرنے کا حکم دیا جو اپنی فضیلت، عدالت، دین کی سمجھ، امانت اور فن تعمیر میں مہارت رکھتے ہوں چنانچہ جو حضرات حاضر ہوئے ان میں حجاج بن ارطاة اور ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بھی تھے۔ پھر آپ نے شہر کی داغ بیل ڈالنے، بنیادیں کھودنے اور اینٹیں بنانے اور چونا پکانے کا حکم دیا اور یہ کام شروع کر دیا گیا پہلے پہل اس کام کی ابتدا ۱۲۵ھ میں ہوئی۔ [معجم البلدان، ج ۲، ص ۴۶، طبع بیروت]

یعنی جس وقت محمد حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم نے خروج و بغاوت کا اقدام کیا اس وقت امام صاحب بارگاہ خلافت میں حاضر تھے اور تعمیر کے کام کی نگرانی کے علاوہ امیر المومنین نے دوسری خدمات بھی ان کے سپرد کر دی تھیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں امیر حسن بن قحطبہ کی بابت حسب ذیل تصریحات ہیں:

۱۔ ۱۳۶ھ میں حسن بن قحطبہ آرمینیا میں متعین تھے اور ۱۳۷ھ میں امیر المومنین کے چچا عبداللہ بن علی السجاد کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دینے موصول آئے اور یہ مہم سر کر کے پھر آرمینیا چلے گئے (طبری، ترجمہ، ج ۳، ص ۷۴-۷۵) اسی مہم میں ابو مسلم کی تخریبی اور باغیانہ عزائم کا کچھا چٹھا لکھ کر انہوں نے حضرت امیر المومنین کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔

۲۔ ۱۳۸ھ میں جب نصرانی بادشاہ نے شام کے علاقوں پر حملہ کیا تو امیر حسن بن قحطبہ کی مدد کے لیے امیر المومنین کے چچا امیر صالح بن السجاد اور ان کے بھتیجے امیر عباس بن محمد الامام ایک فوج گراں لے کر روانہ ہوئے اس جہاد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خانوادہ خلافت کی دو خاتون بھی شریک تھیں یعنی امام علی السجاد کی صاحبزادیاں سیدہ ام عیسیٰ اور سیدہ لبابہ۔

۳۔ ۱۳۹ھ-۱۴۰ھ میں ابراہیم الامام کے فرزند امیر عبدالوہاب عباسی نے امیر حسن قحطبہ کے ساتھ دوبارہ رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۷۴)

۴۔ ۱۴۹ھ میں امیر عباس بن محمد لامام کی معیت میں حسن بن قحطبہ نے رومیوں کے خلاف ایک اور جہاد کیا۔ (طبری، ترجمہ، ج ۳، ص ۳۳۵)

۵۔ امیر المومنین محمد المہدی عباسی کے عہد میں جب رومیوں نے اسلامی شہروں پر یلغار کی تو امیر حسن بن قحطبہ کے تیس ہزار باقاعدہ سپاہ اور ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ روم کے خلاف جہاد کیا۔ (طبری، ج ۳، ص ۴۷۶)

۶۔ اسی طرح خود امیر المومنین المہدی نے جب ۱۶۳ھ میں ولی عہد خلافت ابو جعفر ہارون الرشید کو ساتھ لے کر رومیوں کے خلاف جہاد کیا تو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ امیر حسن بن قحطبہ بھی اسی لشکر میں تھے۔ وکان فی هذا الجیش الحسن بن قحطبہ۔ (البدایہ)

غرض یہ ہے کہ نہ محض امیر المومنین المنصور کے زمانے میں بلکہ ان کے فرزند کے عہد میں بھی حسن بن قحطبہ ایسے دور کے علاقوں اور ایسی مہموں میں مشغول رہے کہ نہ ۱۳۲ھ سے ۱۴۵ھ تک اور نہ ۱۴۵ھ سے ۱۵۰ھ تک اس کا کوئی موقعہ تھا کہ امام ابوحنیفہ اور امیر حسن بن قحطبہ یک جا ہوں اور نہ محمد حسنی کے خروج کے وقت امام صاحب کوفے میں تھے اور نہ حسن بن قحطبہ کبھی قید کیے گئے۔ اگر اللہ کی راہ میں جہاد خلفاء اسلام کا ظلم تھا اور اس میں شرکت معصیت تو بے شک امیر حسن بن قحطبہ نے بڑے گناہ کمائے اور ظلم ڈھائے جن سے ان پر توبہ لازم تھی۔

خدا سمجھے ان اہل قلم سے جو ہماری تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے ہیں لیکن یہ کرامت صحابہ کرام اور خلفاء عظام کی ہے کہ ملت کے اندرونی دشمنوں نے جتنی داستانیں وضع کیں ان میں ان مجہدوں کو روایت وضع کرنے کے سلیقے سے اللہ تعالیٰ نے محروم رکھا کیونکہ یہ ایسی بے پرکی اڑاتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ہنس پڑے۔

غرض یہ کہ امام ابوحنیفہ پر افترا کہ انہوں نے حکومت کے فوجی افسروں کو عدول حکمی پر ابھارا محض بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

امام ابوحنیفہ اور محمد الارقط حسنی

خلافت عباسیہ ۱۳۲ھ میں قائم ہوئی اندلس کے علاوہ تمام عالم اسلام اس کی بیعت میں داخل ہو گیا۔ امیر المومنین المنصور عباسی کو مسند خلافت پر متمکن ہوئے آٹھ برس ہو چکے تھے کہ محمد الارقط بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علیؒ بن ابی طالب نے بغاوت کر دی۔ کہتے ہیں کہ ان کے بھائی ابراہیم بھی اس سازش میں شریک تھے پھر کہتے ہیں کہ ان دونوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ مدینے اور بصرے میں بیک وقت خروج کیا جائے۔ ان دونوں نے امیر المومنین سے بیعت نہیں کی تھی اور روپوش تھے مگر ان کے عزیز نیز ان کے والد عبداللہ المحض نے امیر المومنین السفاح اور امیر المومنین المنصور دونوں سے بیعت کی تھی۔ دونوں کے ہاں ان کا احترام تھا اور خصوصی تعلقات تھے اپنے بیٹوں کے انکار کو وہ غیر اہم بتا کر آئندہ بیعت کے لیے انہیں ہموار کرنے کا اطمینان دلایا کرتے تھے مگر تھیں یہ سب باتیں محض برائے گفتن وہ پوری طرح اپنے فرزندوں کے عزائم میں ان کے ہم نوا تھے۔

حصول حکومت کی تڑپ ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب دعوت عباسیہ کامیاب ہو گئی اور بنو عباسیہ خلافت پر فائز ہو گئے اب انہوں نے بھی یہی ترکیب چلنی چاہی کہ خفیہ خفیہ اپنے ہم نوا پیدا کریں لیکن کام کرنے کا سلیقہ نہ تھا اور امت میں خلافت عباسیہ اتنی مقبول تھی کہ انہیں اپنے حمایتی میسر نہ آ سکے۔ امیر المومنین المنصور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو ان لوگوں کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ اپنے آپ کو ”شیعہ علی“ ظاہر کر کے سب معلومات حاصل کریں۔ چنانچہ بقول طبری حجت قائم کرنے کے لیے عقبہ ازدی کو ”شیعہ علی“ کی طرف ایک نیاز مندانہ خط اور روپیہ دے کر عبداللہ المحض کے پاس بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اپنا اعتبار قائم کر کے انہیں روپیہ دینا اور تحریری جواب بھی لانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ المحض نے روپیہ لے لیا مگر خط کا جواب لکھنے کے بجائے کہا کہ ہم ان لوگوں کو جاننے نہیں۔ اس لیے تحریر نہیں دے سکتے۔ البتہ سلام انہیں پہنچا دینا۔

امیر المومنین المنصور جب حج کے موقعہ پر مدینے حاضر ہوئے تمام ہاشمی سادات نے خیر مقدم کی سعادت حاصل کی عبداللہ المحض بھی آئے خلیفہ المنصور نے ان کی خوب مدارت کی۔ بعد میں دریافت کیا تم اپنے عہد و فاقہ قائم ہو، حکومت کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے؟ انہوں نے جواب دیا بے شک میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ امیر المومنین نے عقبہ کو سامنے آنے کا اشارہ کیا اسے دیکھتے ہی عبداللہ گھبرا گئے۔ دوزانو ہو کر امیر المومنین سے معافی کی التجا کی مگر انہیں قید کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ان کے دو عزیزوں کو بھی جو اس سازش میں ملوث تھے۔

اب سوچنا چاہیے کہ ان لوگوں کے عزائم تو تھے انقلاب لا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لیکن جہاں تک اسباب فراہم کرنے، اپنے حق میں رائے عامہ استوار کرنے اور خروج کے لیے موزوں وقت متعین کرنے کا سوال ہے تو اس کی انہوں نے چنداں ضرورت نہیں سمجھی۔ روپیہ اور خط وصول کر لیا اور جن شیعوں کو جانتے تک نہ تھے انہیں سلام بھی کہلوا دیا مگر اس کی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ شیعہ کہاں ہیں، کتنے ہیں ان کی وفاداری کس حد تک اطمینان بخش ہے اور ان کے وسائل سے انقلابی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں یا نہیں۔

یہ لوگ اس خیالی دنیا میں رہ کر خروج کر بیٹھتے۔ برخلاف ان کے دعوت عباسیہ نے تیس تیس برس کی ہمہ گیر کوششوں کے بعد تمام عالم اسلام کی حمایت حاصل کر کے دو براعظموں میں اپنا پرچم لہرایا۔ کہاں دعوت عباسیہ کی ایک عوامی تحریک اور اس کی ہمہ گیر کامیابی اور کہاں محمد بن عبداللہ حسنی الملقب بہ الارقط کے دعوے کی محض یہ بنیاد کہ ”مجھے ہاشم نے دو دفعہ جنا ہے، عبدالمطلب نے دو دفعہ جنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے دو دفعہ جنا ہے اور حضرت علی نے دو دفعہ جنا ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا (یعنی ان کے خیال میں حضرت علیؑ) اور میں اس کا پوتا ہوں جس پر سب سے کم عذاب ہے یعنی ابوطالب۔“ اس نسلی اور شخصی فضیلت جتانے کو انہوں نے خلافت کی اہلیت قرار دیا مگر یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امت بھی ان تعلیموں پر کان نہ دہرتی ہے یا نہیں۔ حصول حکومت کے لیے جو سب سے اہم بلکہ واحد شرط ہے یعنی رائے عامہ کی اپنے حق میں استواری اس کی طرف سے یہ لوگ ہمیشہ غافل رہے۔ اس لیے

پیہم ومتواتر ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر رہی۔

محمد حسنی ملقب بہ الارقط نے جنہیں سبائیہ نے ”نفس الزکیہ“ کا خطاب دے رکھا ہے اور خود انہوں نے اپنے کو ”مہدی“ بھی کہلوا یا تھا۔ علم سیاست اور آداب جنگ سے قطعاً بے نیاز ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ ان کے خیال میں ان کے شیعوں کی موہوم ہستیاں تو تھیں بلا دُجَم میں اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر بیٹھے مدینے میں۔ حالانکہ اہل مدینہ کی بھاری اکثریت ان کے خلاف تھی کچھ لوگ جو ان کے ساتھ ہو گئے تھے وہ اتنے نہ تھے کہ دو چار گھنٹے ہی عسکر خلافت کا مقابلہ کر سکیں۔

امیر المومنین المنصور نے یہ فتنہ فرو کرنے کے لیے جو فوجی دستہ مدینہ بھیجا تھا اس کی کمان اپنے سگے بھتیجے امیر عیسیٰ ابن موسیٰ بن محمد الامام عباسی کے سپرد کی تھی اور یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی ہاشمی گھر انا ایسا نہ رہے جس کے افراد اس دستے میں نہ ہوں۔ ان میں سے طبری وغیرہ کے بیان کردہ چند طالبی حضرات کے نام حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب۔
- ۲۔ عبد اللہ بن الحسین الاصر بن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب۔
- ۳۔ عمر بن محمد بن عمر بن علی ابن ابی طالب۔
- ۴۔ عبد اللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب۔
- ۵۔ عبد اللہ بن اسماعیل بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب۔
- ۶۔ محمد ابوالکرام بن عبد اللہ بن علی بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب۔
- ۷۔ قاسم بن عبد اللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب۔
- ۸۔ ابو عقیل محمد بن عبد اللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب۔ وغیرہم

ان حضرات میں دلچسپ شرکت امیر محمد عباسی بن امیر المومنین ابوالعباس السفاح کی تھی جو انہی محمد بن الارقط عبد اللہ حسنی کے داماد تھے۔

اس دستے کی ترتیب سے غرض یہ تھی کہ اپنے گھروالوں اور قریب ترین عزیزوں کے سمجھانے سے شاید محمد الارقط حسنی راہ راست پر آجائیں۔ تین دن تک ان حضرات نے امان

پیش کی اور باغیوں کو ہر چند سمجھایا کہ اس غلط اور تباہ کن اقدام سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے۔ البتہ بعض حضرات ان کا ساتھ چھوڑ کر شہر کو واپس چلے گئے۔ اب بھی وقت تھا کہ اپنی سو، تدبیر اور بے سرو سامانی سے عبرت پکڑیں مگر تیر اندازی شروع کر دی۔ اس پر ان کے ابن عم قاسم بن حسن نے امیر عیسیٰ سے کہا کہ حجت پوری ہو گئی اور اب قوت سے جواب دینا چاہیے۔ چنانچہ رن پڑا اور محمد الارقط بڑی بہادری سے لڑے۔ حتیٰ کہ جب تنہا رہ گئے اور اپنے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تب بھی میدان سے نہ ہٹے۔ گرفتار ہونے کے بجائے بے جگری سے جان دی۔ عفی اللہ عنہ۔

ان کی فوج میں بھگدر پہلے ہی مچ گئی تھی کیونکہ ادھر ہنگامہ بپا ہوا اور ادھر سیدہ اسما بنت حسن بن عبداللہ بن عبید اللہ ابن عباسؓ نے اپنی سیاہ چادر مسجد نبوی کے منارے پر لہرا دی۔ باغی سمجھے کہ شہر پر عسکر خلافت کا قبضہ ہو گیا اور مقاومت فضول ہے۔ بہر حال یہ حادثہ فاجعہ ہوا اور بے وجہ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان کے قتل کے بعد ان کی ہمیشہ سیدہ زینب اور صاحبزادی سیدہ فاطمہ نے امیر عیسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب مقتول کی تدفین کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ حسب روایت طبری انہیں با احترام جنت البقیع میں سرکاری اہتمام سے دفن کر دیا گیا۔ ان کا سر کاٹنے اور بغداد بھیجنے کی سب روایتیں باطل ہیں۔ امیر المومنین نے فوجی دستہ روانہ کرتے وقت اپنے بھتیجے سے فرمایا تھا: ”عیسیٰ! میں تمہیں اپنے پہلوؤں کے درمیان (برچھا مارنے) بھیج رہا ہوں۔ اس شخص پر اگر قابو پا لو تو تلوار میاں میں کر کے امان کا اعلان کر دینا۔“ (طبری نیز البدایہ والنہایہ)

یعنی ان کی قرابت قریبہ اور شخصی احترام کا خیال رکھنا جہاں تک ممکن ہو انہوں نے ریزی سے بچنا اور حرم کی حرمت پر حرف نہ آنے دینا ایسی صورت میں افترا پر داز لوگوں کے اس بیان میں کیا صداقت ہو سکتی ہے کہ ان کا سر کاٹا گیا اور جثہ یہود کے قبرستان میں پھینک دیا گیا۔ ان کے داماد اور بھائی بھتیجوں کی موجودگی میں نہ ان کا سر کاٹا جاسکتا تھا اور نہ ان کی لاش کی بے حرمتی کا امکان تھا۔ پھر اس وقت یہود کے مقابر ہی کہاں تھے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے ہی وہ برابر کر دیے گئے تھے اور ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

عن ابی وائل ان علیاً قال لابی الہیاج الاسدی ابعثک علی ما بعثنی
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لاندع قبراً مشرقاً الاسویۃ ولۃ ثلاث
الاطمسة.

[حضرت ابو وائل سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوہیاج اسدی سے فرمایا: میں
تمہیں اس کام کے لیے بھیجتا ہوں جس کے لیے نبی ﷺ نے مجھے بھیجا تھا کہ کوئی
نمایاں قبر ایسی نہ رہے جسے تم برابر نہ کرو اور نہ کوئی بت ایسا رہے جسے تم مسمار نہ
کردو۔] (جامع ترمذی، ج ۱، ص ۱۲۵، باب تسویۃ القبور، طبع مجتبائی دہلی)

حضرت علیؑ کا مذہب ہی یہ ہے اور خود ان کی قبر کا تو صحیح طور سے کہیں نام و نشان نہیں۔
محمد الارقط حسنی کی لاش کی بابت سب باتیں کر بلا کی داستانوں کی طرح عوام الناس کے جذبات
بھڑکانے کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ محمد حسنی کی بغاوت کو جہاد کی رفعت دینے کی کوشش بھی اسی
لیے کی جاتی ہے۔

ایک اور افترا

شیعی راویوں اور تخریب پسند مصنفوں نے اس وضعی روایت کو بڑی شہرت دی ہے کہ
امام مالک نے محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ عمدة الطالب کے
مصنف کہتے ہیں:

وکان مالک بن انس الفقیہ قذاقتی الناس بالخروج مع محمد
وبایعہ ولذلك تغیر المنصور علیہ.

[مالک بن انس فقیہ نے لوگوں کو محمد کے ساتھ ہو کر خروج کا فتویٰ دیا تھا اور ان سے
بیعت کر لی تھی اسی لیے المنصور ان سے بگڑ گئے تھے۔]

یہ افترا محض ہے اور امام مالک کے کھلے ہوئے مذہب کے بالکل خلاف۔ پھر سوال
ہے کہ انہوں نے اگر خروج دیا تھا اور بیعت کر لی تھی تو اس ”جہاد“ میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟

اتنی بڑی بات کہ امت کے متفق علیہ امام کی بیعت توڑ دیں اور پھر جس سے بیعت کی ہے اس کا ساتھ بھی نہ دیں، ایسی ناشایستہ بات ہے کہ امام مالک جیسے عظیم المرتبت فقیہ کے متعلق سوچی بھی نہیں جاسکتی وہ تو اپنے مذہب میں اتنے سخت ہیں اور مسلمانوں کے باہمی نزاع سے اتنے متنفر کہ ایک شخص نے جب ان سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی بابت پوچھا کہ ان میں افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا ”جس شخص نے تلوار اٹھائی (یعنی حضرت علیؓ نے) میں اسے اس شخص سے افضل کیسے کہہ سکتا ہوں جس نے تلوار نہیں اٹھائی۔“ (یعنی حضرت عثمانؓ ذی النورین نے) طبری نے بھی اس ضمن میں دو متضاد روایتیں لکھی ہیں (ج ۳، ص ۲۰۰) ایک تو یہی جو اوپر گزری ذرا تفصیل کے ساتھ اور دوسری بالکل اس کے خلاف۔

اخبرنی غیر واحد ان مالک ابن انس استفتی فی الخروج مع محمد وقيل له ان فے اعناقنا بيعة لابي جعفر فقالا انما بايعتم مكرهين وليس على كل مكره يمين فاسرع الناس الى محمد و لزم مالک بيته۔

[مجھ سے کئی آدمیوں نے بیان کیا ہے کہ مالک ابن انس سے محمد کے ساتھ خروج کی بابت فتویٰ پوچھا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ہماری گردنوں میں ابو جعفر کی بیعت ہے تو انہوں نے فرمایا تم سے یہ بیعت زبردستی لی گئی ہے اور مجبوری کی حالت میں کسی پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں۔ لہذا لوگ محمد کی طرف دوڑ پڑے اور مالک اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔]

کن لوگوں نے یہ بیان کیا اور وہ تھے کس حیثیت کے اس کا کچھ ذکر نہیں۔ پھر سوال ہے کہ خود امام مالک نے خلیفہ المنصور سے بیعت خوشی سے کی تھی یا مجبوراً اس کا بھی ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اہل مدینہ سے جبراً بیعت لینے کی صورت کیا تھی۔ یعنی ایک ایک آدمی کو گرفتار کر کے لایا جاتا تھا کہ بیعت کرے اور اس طرح سب بنو ہاشم اور مہاجرین و انصار کی اولاد نے تلوار کے ڈر سے یہ بیعت کی تھی اور آٹھ برس سے اس جبر پر صابر و شاکر بیٹھے

تھے، غنیمت و فنی سے حصّے بھی لیتے تھے اور دیوان فاروقی کے مطابق وظیفہ بھی اور پھر کہتے تھے کہ ہم اس حکومت سے راضی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ بیعت جبراً لی گئی تھی نہ اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی۔ نہ امام مالک نے ایسا لغو فتویٰ دیا اور اگر دیتے تو گھر میں نہ جا بیٹھتے۔
اب طبری کی دوسری روایت ہے۔ (ص ۱۷۳)

لماحج ابو جعفر ارسل محمد بن عمران بن ابراہیم بن محمد بن طلحہ و مالک بن انس الی اصحابنا فسا لهم ان يدفعوا الیہ محمدًا و ابراہیم ابنی عبد اللہ.....

[جب (امیر المومنین) ابو جعفر حج کے لیے آئے تو آپ نے محمد بن عمران بن ابراہیم بن محمد بن طلحہ اور امام مالک بن انس کو ہمارے آدمیوں کے پاس بھیجا اور ان سے مطالبہ کیا کہ عبد اللہ کے دونوں فرزندوں محمد و ابراہیم کو امیر المومنین کے حوالے کر دیں۔]

گو اس روایت کے مطابق امام مالک نے محض یہی نہیں کہ امیر المومنین سے بخوشی دلی بیعت کی تھی بلکہ وہ ان کے معتمد کارکن بھی تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ اس بیعت کی حرمت کو برقرار رکھ کر باغیوں کو اپنے متفق علیہ امام کے سپرد کر دیں۔ امام مالک کے گھر میں بیٹھ رہنے سے بھی اسی کی توثیق ہوتی ہے کیونکہ عملاً محمد کا ساتھ نہ دینا آپ کے بارے میں متفق علیہ ہے۔

یہ ہے اہل تاریخ کی تضاد بیانی اور حیرت ان پر ہوتی ہے کہ جو روایت واقعات کے مطابق ہوا سے رد کر کے ایسی روایت کو شہرت دیتے ہیں جس کا کوئی عملی ثبوت نہ دے سکیں۔ امام مالک نے اگر فتویٰ دیا ہوتا اور اس کی پذیرائی میں لوگ محمد الارقط حسی کا ساتھ دینے کے لیے دوڑ پڑتے تو کیا یہ نتیجہ نکلتا جو نکلا کہ دو تین گھنٹے بھی مقابلہ نہ کیا جائے گا۔ لہذا ناممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہو یا اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی ہو۔ امام مالک تو اس وقت امیر المومنین المنصور کے مطابق موطا کی تدوین میں مشغول تھے۔ انہیں اس خالص تخریبی ہنگامے سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی۔ جو نصوص صریحہ و ثابۃ کے خلاف تھا اور خود ان کے کھلے

ہوئے مذہب کے بھی خلاف۔

عمدۃ الطالب کے مصنف کی یہ بھی صریح غلط بیانی ہے کہ امیر المومنین المصنوع کا دل امام مالک سے پھر گیا تھا۔ کیونکہ صفحات تاریخ پر دیکھا جاسکتا ہے کہ امیر المومنین نے موطا شریف کی تدوین کی خدمت ان کے سپرد کی تھی اور جو فرمان انہیں بھیجا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

يا ابا عبد الله لم يبق على وجه الارض اعلم مني ومنك واني قد
شغدتني الخلافه فضع انت للناس كتابا ينتفعون به تجنب فيه عن
رخص ابن عباس وشدائد ابن عمر. ووطنه للناس توطاة. قال مالک
فوالله لقد علمني التصنيف يومئذ، ولذا اسمى كتابه الموطاء.

[اے ابوعبداللہ اس وقت روئے زمین پر مجھ سے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں
مجھے تو خلافت نے مشغول کر رکھا ہے لہذا آپ لوگوں کے لیے ایک کتاب مدون
کیجیے جس سے وہ نفع اٹھاتے رہیں اس میں حضرت ابن عباسؓ کی نرمی اور حضرت
ابن عمرؓ کی سختی سے پرہیز کیجیے اور اسے لوگوں کے لیے خوب خوب روندئے (یعنی
بغایت تحقیق کیجیے) امام مالک فرماتے ہیں بخدا اس طرح انہوں نے مجھے تصنیف
کا طریقہ سکھا دیا اور اسی لیے آپ نے کتاب کا نام موطاء رکھا۔ (خوب روندی
ہوئی یعنی بغایت محقق)] (مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۸، طبع مصر)

بعض مورخوں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ فرمان میں حضرت
ابن مسعودؓ کا نام بھی لیا ہے کہ ان کے غرائب سے بچیں۔ یعنی ان کے مسائل سے جو دوسرے صحابہ کے
یہاں معروف نہ ہوں۔ پھر فرمان میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ اوسط امور کا خیال رکھیے اور صحابہ کے
اجماعی مسائل مدون کیجیے۔ اس انداز میں جس شخص کو مخاطب کیا جائے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کاتب
کے دل میں اس کی عظمت اور اہلیت کا احساس نہ تھا اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ امیر المومنین کا دل ان سے
پھر گیا تھا۔ ان کا دل بے وجہ کیوں پھرتا اور اگر پھرتا تو اس کے کچھ آثار تو ہوتے۔

جو امر عیاں ہے وہ یہ کہ موطاء شریف کو قرآن مجید کے بعد عالم اسلام میں دستور

اساسی کی حیثیت حاصل ہوئی اور مشرق و مغرب میں اسے مستند سمجھا گیا۔ یعنی اس کی جو مقبولیت خلافت عباسیہ میں تھی وہی اندلس کی اموی امارت و خلافت میں اسے حاصل رہی۔ امیر المومنین المنصور کی زندگی میں یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی لیکن خلفاء اسلام میں سے پانچ نے اس کی سماعت خود امام مالک سے کی ہے یعنی خلیفہ المہدی، الہادی، الرشید، الامین اور المامون نے۔

امام مالک اور ان کی اس کتاب کی عظمت امیر المومنین ہارون الرشید کے ہاں اتنی تھی کہ خلیفہ ہونے کے بعد محض اس کی سماعت کے لیے اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ مدینے کا سفر کیا تھا۔ پھر جب سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کو معلوم ہوا۔ امیر المومنین ہارون الرشید نے موطاء شریف کے جس خاص نسخے کی سماعت کی تھی وہ مصر کے خزانے میں محفوظ ہے تو ان کی پیروی کی برکت حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس نسخہ سے سماعت کے لیے مصر کا سفر کیا ان دونوں شخصیتوں کے علاوہ غالباً کسی تیسرے کا نام نہیں لیا جاسکتا جس نے حکومت پر فائز ہونے کے بعد طلب علم کے لیے سفر کیا ہو۔ (تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۴، طبع مصر)

امام مالک کا عمل اگر وہ ہوتا جو شیعہ مصنفوں نے بیان کیا ہے اور دوسروں نے اسے شہرت دی تو نہ عالم اسلام میں ان کی یہ حیثیت تسلیم کی جاتی کہ لوگ ہجوم کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور نہ خلفاء کرام کے یہاں ان کا یہ احترام ہوتا، کیونکہ ان کا شمار پھر باغیوں میں ہو جاتا جن کے نہ قاضیوں کے فیصلے قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ گواہوں کی گواہی۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ شیعہ مصنفوں نے جعفر الصادق کے موقف کی اشاعت پر توجہ نہ کی جو اس وقت خاص مدینے میں موجود تھے لیکن امام مالک پر اس خیالی فتویٰ کا بہتان رکھ کر اسے خوب اچھالا اور اس طرح عملاً ثابت کر دیا کہ اہل مدینہ کے یہاں فتویٰ امام مالک کا چلتا تھا۔ ہمارے نزدیک امام مالک نے فتویٰ ضرور دیا ہو گا مگر وہی جو ان کے کھلے مذہب کے مطابق ہے کہ گھروں میں بیٹھیں اور اس شورش میں شریک نہ ہوں اسی پر آپ نے خود بھی عمل کیا اور اہل مدینہ کی اکثریت نے بھی حتیٰ کہ جو تھوڑے لوگ محمد الرقط کے ساتھ میدان میں نکلے تھے وہ بھی تائب ہو کر واپس ہو گئے اور اگر خود محمد الرقط تائب ہو جاتے تو یہ حادثہ کیوں رونما ہوتا۔

یعقوبی افسانہ

اموی اور عباسی خلافتوں کے غیر آئینی اور محمد الارقط حسنی کی بغاوت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے شیعہ مورخ یعقوبی نے یہ افسانہ گھڑا ہے کہ:

”بنو ہاشم کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ جس میں ابو جعفر المنصور بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہاں اموی خلافت کے متوازی خلافت قائم کرنے کے لیے محمد حسنی کا انتخاب کیا گیا اور سب نے مع ابو جعفر المنصور ان سے بیعت کر لی۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے ابو جعفر الصادق کو بھی بلایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ یہ منصب آپ میں کسی کو نہ ملے گا یہ تو اس زرد قبا والے کا حق ہے یعنی ابو جعفر المنصور کا، اسی وقت سے المنصور کے دل میں حصول خلافت کا جذبہ پیدا ہوا۔“ یہ روایت از سر تا پایچ محض ہے۔

۱۔ سب بنو ہاشم ایسے بے اصول اور منافق نہ تھے کہ علانیہ تو خدا اور رسول کے نام پر بیعت کریں ان کے جائز اور آئینی امام ہونے کا اقرار کریں اور خفیہ خفیہ حریف خلافت بھی قائم کر ڈالیں اور وہ بھی بغیر وسائل کے، قرآن حکیم نے ایسی خفیہ کاروائیوں پر سخت توبیخ کی ہے کیونکہ یہ امت کے ساتھ غداری ہے۔

۲۔ جعفر الصادق اور ان کے والد ماجد خالص غیر سیاسی اور علمی زندگی بسر کرتے تھے اور صمیم قلب سے خلفا کی بیعت پر مستقیم رہے سیاسی ہنگامہ آرائی ان کے مسلک کے خلاف تھی۔ اس لیے ناممکن ہے کہ ایسے تخریبی اجلاس میں شرکت فرماتے۔

۳۔ ابو جعفر المنصور کے گھرانے کی اپنی تحریک سا لہا سال پہلے سے خالص تعمیراتی انداز میں چل رہی تھی۔ جس میں قواعد شرعیہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے اس کا امکان نہ تھا کہ وہ اپنے بزرگ، والد ماجد اور جد امجد کی عالم گیر عوامی تحریک کو نقصان پہنچانے اور اسے تخریبی رنگ دینے کے لیے ایسے باغیانہ اجلاس میں شریک ہوتے۔

۴۔ اس روایت کے ہیچ محض ہونے کی عملی دلیل یہ ہے کہ امیر المؤمنین المنصور کی ولادت ۹۵ھ کی ہے (یعنی آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے تھے) دعوت عباسیہ ۱۰۰ھ میں شروع کی گئی اس وقت آپ کی عمر صرف پانچ برس تھی ایسا بچہ کسی زبردست سیاسی اجلاس میں کیسے پہنچ جاتا۔ غرض یہ ہے کہ یعقوبی نے اس فرضی اور خیالی اجلاس کے انعقاد کا افسانہ نہایت بے عقلی سے گھڑا ہے جسے دیگر مورخین خصوصاً شیعہ مؤلفین نقل کرتے رہے ہیں۔ نہ دعوت کی ابتدا سے پہلے ایسے کسی اجلاس کا امکان تھا کیونکہ حضرت امام محمد عباسی کی اپنی تحریک بالکل خفیہ تھی اور آل علی کے نام نہاد شیعہ کی فتنہ سامانیوں کے سبب انہیں اس میں شریک کرنے کی غلطی وہ نہیں کر سکتے تھے۔ دعوت کے اجرا کے بعد تو ایسے کسی اجلاس میں شرکت کا سوال ہی نہ تھا جیسا کہ مذکور ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ایسا کوئی اجلاس منعقد ہی نہیں ہوا۔ بنو ہاشم خلافت قائمہ کے وفادار تھے اور جنہوں نے بغاوت کی انہیں خود اپنے گھر والوں کی بھی حمایت حاصل نہ ہوئی چہ جائیکہ یہ کہ امت ان کی طرف جھکتی۔ چند سبائیوں کے علاوہ انہیں اپنے حمایتی نہ مل سکے اور سبائی وہ تھے جو یوں تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے اور عقیدت کا اظہار کرتے تھے مگر عین وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

یعقوبی نے روایت اس انداز میں لکھی ہے کہ جیسے عبداللہ المنصور عباسی اور محمد الارقط حسنی پختگی عمر کو پہنچ چکے ہوں کہ بنو ہاشم کا ایسا اجلاس منعقد ہو تو اس میں ان کی شخصیتیں نمایاں ہوں۔ حالانکہ ان دونوں کی عمر تو اس وقت اتنی ہوئی جب خلافت عباسیہ قائم ہو چکی تھی۔ تو پھر اس کا امکان کہاں تھا کہ محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی صدارت میں اجلاس ہو اور ابو جعفر المنصور عباسی اس میں ایک عام فرد خاندان کی حیثیت سے جا بیٹھیں یعنی اپنے ہی خلاف ریشہ و انیاں کرنے وہاں پہنچ جائیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور ابراہیم حسنیؒ

اوپر بیان ہوا کہ راویوں کے بقول محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم نے مدینے

اور بصرے میں بیک وقت خروج کا منصوبہ بنایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ ابراہیم حسنی چونکہ اچانک بیمار پڑ گئے اس لیے وقت موجود پر کھڑے نہ ہو سکے اور یوں ایک ساتھ دو محاذ کھول دینے کا موقع جاتا رہا۔ بہر حال ابراہیم نے بعد میں خروج کیا۔ اب سوال ہے کہ منصوبہ تو اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ حکومت قائمہ کا تختہ فوجی طاقت سے الٹ دیا جائے۔ مگر محض ایک شخص کے بیمار پڑ جانے سے خروج ملتوی کر دیا گیا۔ اگر واقعی تیاری مکمل تھی۔ سامان حرب فراہم تھا۔ خفیہ فوج تیار کر لی گئی تھی۔ تمام تفصیلات طے تھیں اور یہ بھی معلوم تھا کہ مدینے اور بصرے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے یعنی دونوں شہروں میں رابطہ کرنے اور فوری پیغام رسانی کے وسائل موجود تھے تو پھر وقت موعود پر خروج کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا ابراہیم حسنی کے علاوہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس ”فوج“ کی قیادت کر سکے؟ یہ عجیب بات ہے کہ منصوبہ تو بنایا جائے انقلاب لانے کا لیکن جو ”فوج“ تیار کی جائے اس میں کوئی قابل اعتماد آدمی نہ ہو یا پھر یہ منصوبہ خود اپنے آدمیوں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بعد کی وضع کردہ باتیں ہیں نہ یہ دونوں خروج کسی منصوبے کے تحت تھے اور نہ ان کے لیے کوئی موثر تیاری کی گئی تھی معمولی غور و فکر سے وہ سب داستانیں ہیچ ثابت ہوتی ہیں جو ان دونوں خروجوں کو اہمیت دینے کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ سوائے عقیم شخص طالع آزمائی کے ان دونوں خروجوں کو کچھ اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد الارقط وغیرہ کی یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی اور دعوت عباسیہ ہی کی طرح عالم گیر۔ یعنی ان کے داعی بھی دنیا بھر میں عباسی داعیوں کے متوازی کام کر رہے تھے۔ لیکن اس خیالی منظر کشی کی نمود کسی جگہ اور کسی موقع پر نظر نہیں آتی۔ محمد الارقط یا ان کے بھائی ابراہیم یا اور کوئی علوی۔ ان میں سے ہر ایک کا خروج بغیر کسی تنظیم کے ہوا اور بغیر کسی محکم اور تعمیری نصب العین کے ہوا۔ اسی وجہ سے ان میں سے کسی کو اتنے مددگار نہ مل سکے جو واقعی کسی درجے میں انقلاب لاسکیں اور مرکز پر ان کا قبضہ ہو سکے۔

خلافت عباسیہ کے انحطاط کے وقت دور دراز علاقوں میں بعض علویہ کا قبضہ بے شک ہو گیا تھا لیکن اکثر و بیشتر وہ بھی عارضی ثابت ہوا۔

ابراہیم نے خروج بصرے میں کیا تھا اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ اتنی زبردست

جماعت تھی کہ امیر المومنین المنصور پریشان ہو گئے راویوں نے یہ خیالی گھوڑے تو دوڑائے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی جھڑپ میں ابراہیم شکست کھا گئے اور سب قصہ تمام ہوا۔

پھر کوئی سلیم القتل شخص کیا یہ باور کر سکتا ہے کہ ایک خاص منصوبے کے تحت خلافت عباسیہ کا تختہ الٹنے کے لیے یہ دونوں بھائی تیاریاں کر رہے تھے، سامان حرب جمع کیا جا رہا تھا اور فوجیوں کی تنظیم ہو رہی تھی لیکن نہ مدینے میں کوئی بے چینی تھی اور نہ بصرے میں دونوں شہروں کے والی خواب خرگوش میں محو تھے اور انہیں خبر نہ تھی کہ ان کے شہروں میں کن عزائم کے تحت کیا کام ہو رہا تھا۔ امیر المومنین کے فرمان کے مطابق کوفے اور بصرے سے اور دنیا جہان سے دار الخلافہ کی تعمیر کے لیے کارکن جمع کیے جا رہے تھے اور سب کام اطمینان سے ہو رہا تھا۔ مگر نہ امیر بصرہ کو خبر تھی کہ ان کے شہر میں ہزاروں افراد نے ابراہیم کی فوج میں نام لکھا دیا اور بیعت توڑ کر خروج کی تیاریاں کر رہے ہیں اور نہ امیر المومنین ہی کے جاسوس کوئی اطلاع آپ تک پہنچاتے تھے۔ اگر بصرے میں کوئی بے چینی ہوتی تو جیسے ایک فوجی دستہ مدینے بھیجا گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ انتظام بصرے کے لیے بھی ہوتا کہ فتنہ سرا اٹھاتے ہی ختم کر دیا جائے۔ یعنی ایک زبردست انقلابی تحریک کی موجودگی میں امیر المومنین کی توجہ اس تحریک کو کچلنے پر مرکوز ہوتی نہ کہ دار الخلافہ کی تعمیر پر۔ یہ کام نہایت امن وامان کے زمانے میں ہوتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ان دونوں علویوں کا خروج نہایت حقیر اور وقتی ہنگامہ تھا جو فرو ہو گیا اور ایسا ہنگامہ ایک عظیم الشان حکومت کے رقبے میں کہیں نہ کہیں ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ امام اعظم حاضر ہیں بارگاہ خلافت میں اور اہم خدمات کی انجام دہی میں مشغول لیکن فتویٰ جاری کر رہے ہیں ابراہیم کے خروج کی حمایت میں یعنی نہ کتاب و سنت کی پروا ہے اور نہ خود اپنے اور اپنے مشائخ کے کھلے مذہب کی۔ اب سوال ہے امام صاحب کے اس خیالی فتوے کو اتنی شہرت کیوں دی جا رہی ہے۔ بقول ان مؤلفین کے جب ”ابن رسول اللہ“ ایک دینی اور ملی تقاضا پورا کرنے کھڑے ہوں تو انہیں ایک عجمی عالم کے فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ دین تو بقول ان کے ان ہی کے گھر سے نکلا تھا نہ کہ بلاد عجم سے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظم کے شاگردوں نے تمام عالم اسلام میں حنفی مذہب رائج کیا اور امت کی بھاری اکثریت نے اس دین کی پیروی کی اس لیے بعد کے مسلمانوں علویوں کے خروج کی اہمیت اور حقانیت ثابت کرنے کے لیے اس فرضی اور اختراعی فتویٰ کا سہارا لینا پڑا، ورنہ مسلمان جو امام اعظم کے متبع ہیں وہ مذہب حنفی کے مطابق ایسے خروجوں کو صریح بغاوت اور ملت اسلامیہ سے غداری تصور کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں دھوکہ دینے کے لیے یہ بات وضع کی گئی کہ امام صاحب نے ابراہیم کے حق میں فتویٰ دیا تھا اس سے بحث نہیں کہ حضرت امام اس وقت کہاں تھے کن فرائض کی بجا آوری میں مشغول تھے اور ابراہیم سے ان کا رابطہ ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔

پھر یہ سوچا گیا کہ فتویٰ کی بات اس وقت تک وزنی نہیں ہو سکتی تھی جب تک امام کے قید ہونے اور ان پر کوڑے پڑنے کی داستانیں بیان نہ کی جائیں اس لیے ان روایتوں کا تانا بانا بنایا گیا۔ لیکن اتنا پھر بھی خیال نہیں کیا گیا کہ امام صاحب کی موجودہ عظمت و شان تو دنیاۓ اسلام میں ان کے شاگردوں کے سبب قائم ہوئی۔ جنہوں نے اپنے امام کے آثار علمیہ اور فقہی آرا کو کتابی شکل دے کر اہل عالم کو اس عظیم شخصیت کے افکار سے روشناس کیا۔ ورنہ ۱۲۵ھ۔ ۱۵۰ھ میں ان کی حیثیت ایسی نمایاں کہاں تھی کہ امیر المومنین پر امت میں ان کی مقبولیت کا رعب پڑے۔ وہ بھی ہزار علما کی طرح ایک بڑے عالم تھے۔ مجتہد مطلق اور مقتدائے عالم تو انہیں بعد میں تسلیم کیا گیا، امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج ۱، ص ۱۱۶) العلماء اربعۃ الثوری وابو حنیفہ ومالک والاوزاعی (عالم چار ہیں سفیان ثوری، ابوحنیفہ، مالک اور اوزاعی) ان میں سے دو کے شاگرد اتنے بڑے تھے کہ اہل عالم میں وہی مشہور ہوئے اور ان کے افکار دنیا میں پھیلے یعنی امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک۔ امام اوزاعی کے افکار بھی امام اعظم کے شاگردوں ہی کے طفیل سے مشہور ہیں۔ مگر کتابوں کی حد تک عامۃ المسلمین تو ان کے نام بھی نہیں جانتے حالانکہ اپنے علم و فضل میں وہ ان دونوں بزرگواروں سے کچھ کم نہ تھے۔ غرض یہ ہے کہ دنیاۓ اسلام میں جو عظمت امام اعظم کی تسلیم کی جاتی ہے وہ اس

وقت نہیں حاصل نہ تھی۔

امیر المومنین المنصور نے جس طرح محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم کی بغاوتوں کا قصہ پاک کیا اور ان کے دوسرے چند عزیزوں کو جرم بغاوت کی اعانت میں قید و بند کی سزا دی اسی طرح وہ امام اعظم کو بھی شہادت کے درجے پر فائز کر سکتے تھے کیونکہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ نہ محمد و ابراہیم کی بغاوت فرو کرنے کے نتیجے میں امت کے اندر کوئی ہجنان پیدا ہوا اور نہ دوسرے ”ابناء رسول اللہ“ کے قید ہونے پر۔ کیونکہ ہم عصر امت صورت حال جانتی تھی۔ اسی طرح امام صاحب کے قید کیے جانے، کوڑے لگائے جانے اور زہر سے قید خانے میں ختم کیے جانے کی داستانوں کے باوجود کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ اہل بغداد نے یا دنیا کے اسلام کے کسی دوسرے گوشے میں مسلمانوں نے امام اعظم کی بابت کسی واقعی یا موہوم سانچے کا کوئی اثر نہیں لیا ہو، امام صاحب کو علانیہ قتل کر دیا جاتا تب بھی ”آل رسول“ کے مقابلے میں ان کی کیا اہمیت ہوتی۔

امام ابوحنیفہ صاحب کے متعلق یہ سب لغو باتیں بعد کے لوگوں کی تراشی ہوئی ہیں اور ان کی وفات کے تین سو برس بعد اس وقت وضع کی گئیں جب سبائی پروپیگنڈا اپنے عروج پر تھا اور حضرت امام کو امت نے مجتہد مطلق اور مقتدائے عالم تسلیم کر لیا تھا تا کہ وہ مسلمان جو علویوں کے خروج اور ان کے انجام پر برا فروختہ نہیں ہوئے انہیں امام اعظم اور امام مالک پر خلافت قائمہ کے مظالم کی فرضی داستان ہی سے متاثر کیا جائے۔ افسوس ہے کہ خطیب بغدادی نے بے سوچے سمجھے یا امام صاحب سے تعصب کے تحت یہ وضعی روایتیں اپنی کتاب تاریخ بغداد میں لکھ ماریں۔ بعد کے لوگ ان خرافات کو ایسے لے اڑے کہ آج اسے حقیقت ثابتہ باور کرایا جاتا ہے۔ تاریخ بغداد یا مناقب نعمان کی کتابوں میں ان روایتوں سے سب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جن سے صحیح احوال کا پتہ چلایا جاسکتا ہے ان واقعات ثابتہ کے مطابق ہیں۔ مگر جن کے دلوں میں بیماری ہے انہیں صاف اور دل کو لگتی روایات کے مقابلے میں وہ وہابی روایتیں مرغوب ہیں جن کے ذریعے خلفائے اسلام پر طعن کی گنجائش نکلے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اموی اور عباسی

خلافتوں کی شرعی حجت پر حرف لا کر یہ ثابت کریں کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب اور ان کا اتباع نے ان خلافتوں پر اجماع کر کے دین مبین کو غارت کر دیا تھا اور بزم خویش ”ایک عظیم مفکر اسلام“ کے قول کے مطابق اپنی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

تاریخی حقیقت یہ ہے امام اعظم کونہ کبھی قید کیا گیا نہ ان پر کوڑے برسائے گئے نہ انہیں زہر دیا گیا اور نہ انہوں نے زید و محمد و ابراہیم کی حمایت میں فتویٰ دیا اور نہ حسن بن قطنہ سے ان کی کبھی ایسی ملاقات ہوئی کہ وہ انہیں خلافت قائمہ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ پوری طرح امیر المومنین کی بیعت پر قائم تھے اور قواعد شرعیہ کے مطابق ان کے مطیع و منقاد رہے۔ منصب خلافت کی عظمت ان کے دل میں تھی اور امیر المومنین کی خدمات جلیلہ انجام دینا وہ اپنا دینی و ملی فریضہ جانتے تھے اسی لیے ان کے نقش قدم پر ان کے عظیم المرتبت شاگرد چلے اور دنیا کو نور و حکمت سے بھر دیا۔

اگر امام اعظم عیاذ باللہ خلافت قائمہ کے خلاف ہوتے اور باغیوں کے ہم نوا تو لازم تھا کہ امیر المومنین کی نگاہوں سے گر جائیں اور ان کے شاگردوں کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو ہوا بلکہ یہ عظیم المرتبت ائمہ بھی اپنے شیخ و امام کے مسلک کے خلاف حکومت قائمہ کے مناصب قبول نہ کرتے اور یہ ایک ایسا ثقافتی سانحہ نہ ہوتا کہ اس سے امت کا پورا مستقبل تباہ ہو جاتا اور وہ درخشانی ہرگز نہ آتی جس کی آب و تاب سے اہل عالم کی نگاہیں خیرہ ہیں۔ محمد الارقط و ابراہیم کے خروجوں میں امام اعظم و امام مالک کے موقف کی صفائی کے بعد ہم اب اس افترا پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو امام ابوحنیفہ اور مکتبہ حنفیہ پر کیا گیا ہے۔ تدوین فقہ حنفیہ کے متعلق جو غلط بیانیوں رسوائے عالم کتاب خلافت و ملوکیت میں کی گئی ہیں اس کی تنقیح و تردید تو پہلے بھی کتاب حقیقت خلافت و ملوکیت میں کی جا چکی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فقہاء صحابہ میں عبادلہ اربعہ ہیں یعنی خلفہ اربعہ کے بعد اپنے زمانے میں شیخ الصحابہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اور مدینے کے فقہاء اربعہ زمانہ تابعین چار بزرگوار ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب، حضرت عروہ بن الزبیر، حضرت عبدالملک بن مروان اور قصبہ بن الذویب۔ ان کے بعد جن حضرات کو فقہاء سبعہ کہا جاتا ہے تو مراد ہوتے ہیں حضرت سعید بن مسیب، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت، حضرت عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، حضرت سلمان بن یسار اور ساتویں کے بارے میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام ہیں۔ یہاں حضرت عبدالملک بن مروان کا نام نہیں لیا جاتا کیونکہ ان کا شمار پھر خلفاء اسلام اور امراء المؤمنین میں ہو گیا اور حضرت قصبہ کا نام اس لیے نہیں کہ وہ شام تشریف لے گئے تھے اور اموی خلافت کے عدلیہ کا انتظام سنبھال لیا تھا جن حضرات کے نزدیک ساتویں فقیہ مدینہ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن ہیں ان میں سے ایک صاحب نے ساتویں کے نام اس طرح نظم کر دیے ہیں:

الامن لا یقتدی بائمة فقسمة ضنیروی من الحق خارجه
[یاد رکھو جو شخص ان اماموں کی اقتداء نہیں کرتا۔ اس کی قسمت کھوٹی ہے اور وہ حق سے باہر ہو گیا۔]

فخذہم عبید اللہ عروۃ قاسم سعید ابوبکر سلیمان خارجه
[تو انہیں گن لو وہ عبید اللہ (بن عبداللہ بن عتبہ) ہیں، عروہ (بن الزبیر) ہیں، قاسم (بن محمد بن ابی بکر) ہیں، سعید بن المسیب ہیں۔ ابوبکر (بن عبدالرحمن) ہیں سلیمان (بن یسار) ہیں اور خارجہ بن زید ہیں۔]

انہی حضرات سے تمام فقہاء ائمہ حدیث استناد کرتے ہیں صحاح ستہ کے سب مصنفوں نے ان کی روایات لی ہیں ان میں عروہ بن الزبیر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے سگے بھانجے اور

تر بیت دادہ تھے، حضرت قاسم بن محمد اور حضرت سالم بن عبداللہ دونوں حضرات ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے بھتیجے اور تر بیت دادہ تھے۔ حضرت سلیمان بن یسار ام المؤمنین سیدہ میمونہ کے مولیٰ اور تر بیت دادہ تھے، حضرت خارجہ اپنے والد سیدنا زید بن ثابتؓ کے تر بیت دادہ تھے ان حضرات نے بکثرت صحابہ کی صحبت اٹھائی تھی ان میں سے چھ سے امام ابن شہاب زہری نے فیض اٹھایا اور ان سے امام مالکؒ نے، حضرت سلیمان بن یسار سے حضرت یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمن نے اور ان سے امام مالکؒ نے۔

۲۔ حجاز کے متعلق حضرت محمد الامام عباسی کا حکم تھا کہ عباسی داعی وہاں کچھ کام نہ کریں اس لیے حرمین شریفین میں اختلال کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے پائی اور کامل امن رہا حرمین پر قبضہ سب سے آخر میں کیا گیا اور یہ قبضہ بغیر کسی خونریزی کے ہو گیا کیونکہ عباسی امامت پر امت متحد ہو چکی تھی۔



امیر المومنین المنصور امام ابوحنیفہ اور مکتبہ حنفیہ

امیر المومنین ابو جعفر عبد اللہ الامام المنصور بن محمد الامام بن علی السجاد بن عبد اللہ
حبر الامۃ بن عباسؓ عم رسول اللہ ﷺ کا عہد مبارک ثقافت اسلامیہ کے ارتقا میں سنگ میل کی
حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اس امت کے عظیم ترین ائمہ میں ہیں، حدیث وفقہ و لغت و ادب میں
ایسے بلند پایہ تھے کہ اگر حلقہٴ درس قائم کرتے تو ان کے جد بزرگوار سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کی یاد
تازہ ہو جاتی دور دور سے لوگ طلب علم کے لیے حاضر ہوتے امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

وكان المنصور في شبته يطلب العلم من مظانه والحديث والفقہ
فنال جانباً جيداً وطرفاً صالحاً

[اپنی جوانی میں المنصور نے ہر صاحب کمال سے علم حاصل کیا۔ نیز حدیث وفقہ
اس طرح آپ کو رتبہ بلند اور درک قوی نصیب ہوا۔] (البدایہ والنہایہ، ج ۱،
ص ۱۲۶)

محدثوں کا جو طریقہ تھا کہ طلب حدیث کے لیے دور دور کا سفر کرتے تھے ایک شہر کے
علما سے فیض اٹھا کر دوسرے شہر کا رخ کرتے تھے ایسے سفر کو رحلۃ کہتے ہیں۔ امام المنصور کی
رحلۃ کا یہی عالم تھا۔ مشرق کا شاید ہی کوئی اہم شہر ایسا چھوڑا ہو جہاں طلب علم کے لیے نہ پہنچے
ہوں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے: وقد كان ابو جعفر بمكان من العلم
قبل الخلافة وبعدها (ص ۱۸، طبع مصر) ”(امیر المومنین) ابو جعفر علمی اور دینی اعتبار سے

خلافت سے پہلے بھی بلند رتبہ تھے اور بعد میں بھی۔ یعنی امور خلافت میں انہماک سے آپ کے علم کی تازگی اور زہد و تقویٰ کی کیفیت ماند نہیں پڑی تھی۔ ہمعصر علما نے آپ کی علمی شان اور دینی عظمت کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا اور یہ آپ ہی کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ تھا کہ علوم و فنون کی تدوین و نشر و اشاعت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے امت مسلمہ کو اہل عالم کے لیے نمونہ بنایا اور دلوں میں اس کی پیروی کی لگن پیدا کر دی۔

حرکت علمی

اموی عہد مبارک میں متمدن دنیا کا بہت بڑا رقبہ خلافت اسلامیہ کے تحت آچکا تھا۔ تین براعظموں میں امت پھیل چکی تھی اور ایسے مختلف النوع عناصر ملت میں داخل ہو گئے تھے کہ دین مبین کو خالص شکل میں محفوظ و مدّون کرنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا چنانچہ خلافت عباسیہ کے قیام کے ساتھ ہی امیر المومنین المنصور نے یہ محسوس کر لیا کہ اب فتوحات کے بجائے وقت اس کا آگیا کہ ثقافت اسلامیہ کے تحفظ و ارتقا کی سبیل نکالی جائے تاکہ دین کے تمام کلیات و جزئیات کتابی صورت میں مدّون ہو جائیں اور خلافت کا ایسا آئین و دستور مرتب کر لیا جائے کہ جو آئندہ کے لیے مشعل راہ ہو۔ مسلمان اس قابل ہو جائیں کہ انہی اصول و قواعد کے مطابق احوال حاضرہ کے ساتھ چل سکیں یعنی انسانی ارتقا کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آتے جائیں ان کا حل دریافت کرنے کی قدرت و صلاحیت رکھیں، غیر عرب عناصر کے قوت پکڑ لینے سے اس اقدام کی ضرورت اور بھی واضح ہو گئی تاکہ ثقافتوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے پائے اور کسر و انکار کا انجام تعمیر ہی رہے۔

یوں حکومت کے استحکام کے بعد، دار الخلافہ کی تعمیر سے بھی پہلے آپ نے بڑے بڑے علمائے مصر کو اس طرف متوجہ کیا اور ۱۳۳ھ میں فرامین نافذ کیے چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں:

فی سنہ ثلاث و اربعین شرع علما الاسلام فی هذا العصر تدوین

الحديث و الفقه و التفسير فصف ابن جريح بمكة و مالک المؤطا

بالمدينة والاوزاعی بالشام وابن ابی عروبة وحماد بن سلمة وغيرهما بالبصرة، ومعمرو وسفيان الثوري بالكوفة، وصنف ابن اسحق المغازي وصنف ابو حنيفة رحمه الله الفقه والرأي.

ثم بعد يسير صنف هشيم والليث وابن لهيعة ثم ابن المبارك وابو يوسف وابن وهب وكثر تدوين العلم وتبويبه ووثنت كتب العربية واللغة والتاريخ وایام الناس و قبل هذا العصر كان الائمة يتكلمون من حفظهم او يرون العلم من صحف صحيحة غير مرتبة [۱۴۳ھ میں اس زمانے کے علمائے اسلام نے حدیث وفقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی، چنانچہ ابن جریج نے مکے میں تصنیف کی اور (امام) مالک نے مدینے میں موطا لکھی۔ (امام) اوزعی نے شام میں، ابن ابی عروبة اور حماد بن سلمہ وغیرہما نے بصرے میں، معمر نے یمن میں، سفيان ثوري نے کوفے میں، کتابیں لکھیں اور (امام) ابوحنیفہ نے فقہ اور رائے مدون کی۔ پھر کچھ دن بعد ہشیم، الليث نے ابن لہیعہ اور پھر ابن المبارک، ابو یوسف اور ابن وهب نے کتابیں لکھیں۔ یوں علم کی تدوین و ترتیب کی کثرت ہو گئی عربی، لغت، تاریخ اور ایام الناس پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے ائمہ یا تو اپنے حفظ سے تعلیم دیا کرتے تھے یا ایسے صحیح نوشتوں سے جو غیر مرتب تھے۔] [تاریخ الخلفاء، طبع مصر]

اموی عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی کہ تحریری کام ہو کیونکہ وہ زمانہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کا تھا جو تمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ ان کا فیض جاری تھا اور ان کے صحبت یافتہ حضرات ان کے علوم کی اشاعت کر رہے تھے۔ جگہ جگہ علما و فقہاء کے حلقہ ہائے درس قائم تھے اور اہل عرب کے طرز پر تمام تدریس زبانی ہوتی تھی۔ یعنی علم سینہ بہ سینہ چلتا تھا مسلمانوں کی زیادہ توجہ جہاد فی سبیل اللہ پر تھی۔ وہ جدھر رخ کرتے تھے ان کی فطری تعلیمات کی سادگی اور ان کے کردار کی رفعت دلوں کو مومہ لیتی تھی۔ فقہی موشگافیوں کے بجائے مدارس کی عمل پر تھا۔ اموی خلیفہ

عمر الثانی نے اگرچہ علمائے وقت کو تصنیف و تالیف پر متوجہ کیا تھا اور بعض رسائل اور نوشتے مرتب بھی ہوئے تھے لیکن یہ کام ابتدائی تھا اور نوشتوں کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ انہیں مدون اور مبسوط تصنیفات کا درجہ دیا جائے جیسا کہ امام ذہبی نے وضاحت فرما دی ہے۔ ویسے تحریری کام آنحضرت ﷺ کے دور ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے متعدد فرامین کے ذریعے مسائل پر رسالے مختلف مقامات پر بھجوائے تھے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان محفوظ ہے۔

وامن اصحاب النبی ﷺ احد اکثر حديثاً عنه مني الاماكان من
عبدالله بن عمرو فانه كان يكتب ولا يكتب.

[نبی ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی صاحب آپ کی احادیث بیان کرنے میں مجھ سے زیادہ نہیں سوائے عبداللہ ابن عمروؓ (بن العاص) کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔] (ج ۲ ص ۳۲، طبع مصر)

لیکن آخر عہد اموی تک علماء و فقہاء کا عام طریقہ کار یہی تھا کہ حفظ سے درس دیا کرتے تھے۔ شاگرد جو سنتے اسے دماغوں میں محفوظ رکھتے تھے اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو حفظ کرنے کے لیے۔ چنانچہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے: لم یکن القوم یکتبون انما کانو یحفظون فمن کتب منهم شیاً فانما یکتبه لحفظه فاذا حفظه محاه [لوگ لکھا) نہیں کرتے تھے بلکہ صرف یاد کیا کرتے تھے اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ لکھا تو یہ تحریر محض حفظ کرنے کے لیے ہوتی تھی۔ جب وہ حفظ کر لیتا تو مٹا دیتا۔]

یہ عرب کا خاصہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حفظ کی خاص صفت سے نوازا تھا۔ ایک دفعہ کی بات سنی ہوئی ان کے دماغوں میں محفوظ رہتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی قوت حافظہ قائم رکھنے کے لیے کتابت سے گریز کرتے تھے اور یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جو شخص ظاہر پر تکیہ کرتا ہے اس کی باطنی قوت گھٹ جاتی ہے۔ ابن عبدالبر نے ان علماء کے اقوال نقل کر کے جو کتابت پسند نہیں کرتے تھے لکھا ہے:

من ذکرنا قوله فی هذا لالباب فانما ذهب فی ذلک مذهب العرب

لانہم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذلک والذین کرہوا الكتاب کابن عباس، والشعبي وابن شہاب والنخعي وقنادۃ ومن ذهب مذهبہم وجبل جبلتہم کانوا قد طبعوا علی الحفظ۔

اس موضوع پر جس جس کا قول ہم نے دہرایا ہے تو ان کا طریقہ وہی تھا جو عربوں کا ہوتا ہے وہ فطری طور پر یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ ان کی خصوصیت ہے جو حضرات لکھائی پسند نہیں کرتے جیسے حضرت ابن عباسؓ، امام شعیؒ اور امام ابراہیم نخعیؒ اور حضرت قنادہؒ اور وہ سب لوگ جن کا یہی طریقہ تھا اور ایسی ہی ذہنیت تھی انہیں طبعی طور پر حفظ کرنے کا ملکہ تھا۔]

چنانچہ امام شعیؒ فرماتے ہیں ما کتبت سوا ذّا فی بیاض ولا استعدت حدیثا من انسان (میں نے کوئی بات کاغذ پر نہیں لکھی اور نہ کسی شخص سے اپنی بات دوبارہ کہنے کو کہا) حضرت ابن عباسؓ نے عمرو بن ربیعہ کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر اسی طرح سنا دیا تھا۔ یہ تھا عرب کا حال اور وہ ماحول جب تک قائم رہا غیر عرب بھی اسی طرز پر چلے لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد صورت حال بدل گئی اور معاشرے کا تقاضا یہی ہوا کہ اب حفظ پر مدار نہیں ہو سکتا اور نہ ایک منظم اور آئینی حکومت اس طرح چل سکتی ہے کہ اس کا قانون کتابی صورت میں مدّون نہ ہو۔

اس بارے میں امیر المومنین المنصور کی لگن اور عزیمت کا یہ عالم تھا کہ فرامین بھیجنے کے علاوہ اکابر میں سے بعض کو بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے طلب فرمایا جیسے امام اعظم اور امام اوزاعی کو۔ چونکہ امام مالکؒ کسی طرح مدینے سے باہر جانے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے ان کے پاس خود جا کر گفتگو کی۔ اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے: حجازی، عراقی اور شامی اور ہر مکتبے میں استخراج مسائل کے لیے مجملہ منقولات کے مقامی ”عرف“ کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

عرف

فقہی امور میں کتاب و سنت کے صریح احکام کے علاوہ عرف بھی ایک دلیل شرعی

ہے۔ یعنی امور معاشرت اور معاملات میں مقامی رسم و رواج کے مطابق طریقہ کار۔ ہر دستور جو احکام شرعیہ کے خلاف نہ ہو اور اس میں لوگوں کے لیے آسانی نظر آئے اور عمومی منفعت معلوم ہو اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ دعوت محمدیہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ اقوام عالم کے ثقافتی اور تہذیبی شعائر و رسوم کو منسوخ و مردود قرار دے وہ تو ایک ارتقائی تحریک ہے اور عظیم ترین جو نوع انسانی پر تمام نعمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جاری کیا اسی لیے مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ قوموں کا ثقافتی سرمایہ محفوظ کریں ان کے علوم و فنون کو ترقی دیں اور ان کے تمام امور کو عربی قالب دے کر ارتقائی انداز میں سب کا مشترک سرمایہ حیات بنادیں، یعنی ان کے اختلافات کی تعدیل کر کے وجہ اختلاف پیدا کریں۔ اسی لیے فقہاء کے ہاں عرف کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر علاقے کی اپنی خصوصیات اور ہر ملک کے اپنے دستور ہوتے ہیں، سیاست، معاشرت معاملات، قوانین مملکت اور آداب نظم و نسق وغیرہ امور سے وہاں کے لوگوں کو انس ہوتا ہے اور مناسبت ہوتی ہے۔ اب فقہاء کا کام ہے کہ اقوام عالم کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور جو امور کتاب و سنت کے صریح احکام سے متعارض نہ ہوں، انہیں باقی رہنے دیں اور جہاں تعارض ہو وہاں ان کی اصلاح کر کے قواعد و دینیہ کے تحت لے آئیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے ایک فقہ حجاز جس کے علمبردار امام مالک تھے یہاں کا عرف عربی تھا اور عموماً صحابہ کرام کے قبائلی ماحول پر مبنی۔ دوسرا مکتب فقہی عراق کا تھا جس کی نمائندگی امام اعظم کرتے تھے۔ یہاں کی معاشرت و ماحول میں عجمیت کا امتزاج تھا، تیسرا مکتب فقہ شام کا تھا جس کے مرجع امام اوزاعی تھے۔ یہاں کی معاشرت اور آداب معیشت میں رومی تمدن کا امتزاج تھا، گویا ان تین مکتبہائے فقہ کے ذریعے حجاز و عراق و شام کے عرف مستند قرار پائے اور یوں عرف کو عالم گیری ملی اور آئندہ کے لیے بھی طے ہوا کہ مسلمان جہاں جائیں وہاں کے عرف کی افادیت دیکھ کر اپنے اصول و قواعد کے تحت لے آئیں۔ اس طرح ثقافت اسلامیہ کا ارتقا ہوا۔

خلافت عباسیہ کے قیام میں بلاد عجم کی تائید کو زیادہ دخل تھا اس لیے امیر المومنین

المنصور کی توجہ امام ابوحنیفہ کے طریقہ استدلال اور طرز استنباط پر مرکوز ہوگئی آپ نے امام صاحب کی یہ حیثیت پہچانی کہ انہیں اپنے حضور طلب کریں اور ان کے ذریعے ایک وسیع فقہی مکتبے کی بنیاد رکھیں جو تمام عالم اسلام میں مقبول ہو سکے۔ اسی لیے امام اعظم کو اپنے پاس رکھا۔ پھر آپ ہی کے فاضل شاگردوں کو خلافت عباسیہ میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا گیا۔

امیر المومنین المنصور کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے سپرد جو کام کریں اس کے بارے میں تحقیق کر لیں کہ اپنے فقہی اصول میں وہ صحابہ کرامؓ کے منہاج سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ یہ غلط اطلاع آپ کو ملی تھی کہ امام ابوحنیفہ کے ہاں مدار قیاس پر ہے اور وہ حدیث پر اسے مقدم رکھتے ہیں اس لیے اس بارے میں ان سے وضاحت طلب کی امام صاحب کا یہ جواب شیخ ابوہریرہ نے اپنی کتاب ابوحنیفہ میں بھی نقل کیا ہے۔ (ص ۲۷۰)

یروی ان ابا جعفر المنصور كتب اليه بلغني انك تقدم القياس على الحديث فرد عليه ابو حنيفة برسالة جاء فيها وليس الامر كما بلغك يا امير المومنين انما اعمل اولاً بكتاب الله ثم بسنة رسول الله ﷺ ثم باقضية ابى بكر وعمر وعثمان وعلى رضى الله عنهم ثم باقضية يقية الصحابة ثم اقيس بعد ذلك اذا اختلفوا .

[روایت ہے کہ (امیر المومنین) ابو جعفر المنصور نے انہیں لکھا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں۔ تو امام ابوحنیفہ نے انہیں مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا۔ امیر المومنین بات وہ نہیں ہے جو آپ کو پہنچی ہے میں اول کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر سنت رسول ﷺ پر پھر حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فتاویٰ پر اس کے بعد جب ان میں اختلاف پاتا ہوں تو قیاس کرتا ہوں۔]

امیر المومنین المنصور کو سنت کی حفاظت کا اتنا اہتمام تھا کہ اس بارے میں تمام امور کی نگرانی آپ خود فرماتے اور ہدایات دیتے تھے جیسا کہ تدوین آثار کے سلسلے میں امام مالک کو

آپ نے فرمان بھیجا جو ہم دوسری جگہ نقل کر چکے ہیں یعنی محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی کے سلسلے میں، امیر المومنین موصوف کی اس سعی مشکور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وهكذا اسس المنصور لحياة علمية ادبية في بغداد وكان اول ما
انشأ بها مدارس الطب والعلوم الدينية انفق في سبيلها اموالا طائلة.
[اس طرح (امیر المومنین) المنصور نے بغداد میں علمی ادبی زندگی کی بنیاد ڈالی اور
سب سے پہلے آپ نے وہاں طبی اور دینی علوم کی درسگاہیں قائم کیں اور اس راہ
پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔]

یہی بات کتاب المعارف کے مقدمہ نویس ثروة عکاشہ نے لکھی ہے کہ عباسی خلفا
کس طرح علوم و فنون کی تدوین و نشر اشاعت پر حریص تھے وہ کہتے ہیں:

كانوا من الخلفاء العلماء فرغبوا في العلم واحسنوا وفادة اهله و
شجعوهم عليه وانتعشت ببغداد ايامن فيها وبمن وفدا اليها واصبحت
ميداناً لحركة علمية فكرية واسعة.

[یہ خلفا چونکہ علما تھے اس لیے انہوں نے تحصیل علم پر لوگوں کو متوجہ کیا اہل علم کی
قدردانی کی اور اس پر ان کی ہمت بندھائی۔ اس طرح بغداد (علمی اور ثقافتی) حیثیت
سے پروان چڑھا اور خود ان کے لیے جو وہاں رہتے ہوں اور ان کے لیے بھی جو باہر
سے وہاں آئیں، فکری اور علمی حرکت کے لیے ایک وسیع میدان بن گیا۔]

امام ذہبی نے اپنے بیان میں یہ تصریح نہیں کی کہ ۱۴۳ھ سے تصنیف و تالیف کا جو
کام شروع کیا گیا وہ امیر المومنین المنصور کے فرامین کی پذیرائی میں تھا لیکن یہ بات خود بخود سمجھ
میں آ جاتی ہے ورنہ سب جگہ ایک ہی سال سے کام کیوں شروع ہوتا۔ جب تک مرکز کی طرف
سے سب کو بیک وقت ہدایت نہ پہنچتی۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے وسائل ایسے نہ تھے کہ
ایک کام سن کر دوسرا بھی اسی وقت شروع کر دے۔

علاوہ ازیں چند حضرات کے اسماء گرامی یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن کے متعلق

صراحتاً معلوم ہے کہ ان کی تصنیف و تالیف کی ابتدا امیر المومنین المنصور کے فرمان پر ہوئی۔

۱۔ امام مالک

محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی کی بغاوت کے احوال میں وہ فرمان ہم نقل کر چکے ہیں جو امیر المومنین المنصور نے آثار سلف کی تدوین کے سلسلے میں انہیں بھیجا اور ساتھ ہی تالیف کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اسی فرمان کے آخری فقرے سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی کتاب کا نام ہی الموطار کھا۔

۲۔ محمد بن اسحاق

یہ ایک ایرانی الاصل شخص تھے۔ انہوں نے مغازی پر کتاب لکھی جس میں بے سرو پا حکایات بھی لکھ دیں۔ بہر حال یہ ابتدائی کام تھا۔ امیر المومنین نے ملاحظہ فرما کر اسے قبول بھی کر لیا مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کی تدوین دوبارہ کریں۔ چنانچہ سیرۃ ابن ہشام کے مقدمے میں ہے کہ امیر المومنین موصوف نے فرمایا تھا: لقد طولته یا ابن اسحق اذهب فاختصرہ والقی الکتب الکبیر فی خزائنہ امیر المومنین [ابن اسحاق تم نے اسے بہت طویل کر دیا۔ جاؤ اور اسے مختصر کرو پھر وہ طویل کتاب امیر المومنین کے کتاب خانے میں داخل کر دی گئی۔]

ابن اسحاق نے اسے مختصر کر دیا جو امت میں متداول ہے انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر اہل قلم نے اس پر نظر ثانی ضروری سمجھی چنانچہ ابن ہشام نے اسی سے اپنی مشہور و مقبول سیرۃ مرتب کی اگرچہ پھر بھی بہت سی باتیں اس میں محل نظر ہیں اور اہل تحقیق ان کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ امام اعظم ابوحنیفہ

امام صاحب کا طریقہ تدریس وہی تھا جس کی پابندی اموی عہد کے تمام علماء و فقہا

کرتے تھے۔ یعنی تعلیم زبانی ہوتی تھی اور علم سینہ بہ سینہ چلتا تھا۔ آپ کے ہاؤن برس عہد اموی میں گزرے اور اسی پنچ پر جو آپ کے اساتذہ کرام اور ہم عصر علما کا تھا۔ یعنی تقریر پر مدار تھا اور شاگرد سب ارشادات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو یاد کرنے کے لیے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ عباسی عہد میں بھی ۱۴۲ھ تک آپ نے یہی طریقہ قائم رکھا۔

لیکن جب ۱۴۳ھ میں آپ نے کتابی صورت میں علم مدون کرنا چاہا اور اس کے لیے خاکہ مرتب کیا تو دو برس بعد آپ کو بغداد طلب کر لیا گیا اور آخری پانچ برس آپ کے وہیں گزرے۔ ان پانچ برسوں میں آپ کے متعلق تین کام تھے۔ ایک دار الخلافہ کی تعمیر کی نگرانی، دوسرے یہ کہ بارگاہ خلافت میں امیر المومنین کی فقہی آرا معلوم کرنے کے لیے دیار و امصار سے جو استفنا آئیں ان کے مناسب جواب دینا اور تیسرے یہ کہ خلافت اسلامیہ کے دفاعی امور پر منضبط و مدون کتاب مرتب کرنا۔ گویا امام صاحب کی زندگی کے یہ آخری پانچ سال انتہائی مشغولیت کے گزرے چنانچہ خود الملکی نے اپنی متضاد روایات کے انبار میں یہ سچی بات لکھ دی۔

ان ابا جعفر کان نقل ابا حنیفة من الکوفة الی بغداد وحبسه عند نفسه واراد علی القضاء غیر مرة فاعتذر واستعفی واحتال بکل حيلة فی رفق ومدارة حتی عفاه و امره بالاقامة علی یابه حتی یعرض علیه ما ورد من المسائل و القضايا من الامصار فی نظر فیها ویامر ما یحب به ان یؤمر. فلم یزل مقیما عنده ببغداد لایأذن له فی الا نصراف الی الکوفة حتی مات بها. (مناقب النعمان، ج ۲، ص ۱۰۸)

[امیر المومنین] ابو جعفر نے (امام ابوحنیفہ) کو کوفہ سے بغداد بلایا تھا اور اپنے ہی پاس انہیں ٹھہرایا۔ کئی مرتبہ انہیں قاضی بنانا چاہا مگر وہ نرمی اور ادب کے ساتھ قسم قسم کے حیلوں سے اس منصب سے معاف رکھے جانے کے خواستگار ہوئے جب تک کہ انہوں نے انہیں معاف رکھا مگر حکم دیا کہ بارگاہ میں حاضر رہیں تاکہ مختلف شہروں سے جو حل طلب مسائل اور معاملات آئیں ان پر نگاہ ڈالیں

اور مناسب احکام صادر کریں چنانچہ انہی کی خدمت میں وہ مستقل طور پر بغداد رہے آپ انہیں کوفے واپس ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے جب تک کہ وہیں انہوں نے (یعنی حضرت امام نے) وفات پائی۔ [۲]

ایک سیدھی سادی بات کو ان صاحب نے ہیر پھیر سے بیان کیا ہے کہ گویا یہ جبر تھا حالانکہ یہ ان پر امیر المومنین کے بغایت اعتماد کے سبب تھا اور اس خاص اہم دینی ضرورت کے لیے وہ امام اعظم کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے کیونکہ خود امیر المومنین کو اپنے مسلکی مسائل کے سبب اس طرف توجہ کی فرصت نہ تھی۔

۳۔ تحریری کام

حضرت امام کے سب سے چھوٹے شاگرد امام محمد بن حسن آپ کے قیام بغداد کے زمانے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہیں آپ نے امور دفاع پر اپنی دونوں کتابیں سیر کی املا کرائیں۔ حکومت اسلامیہ کے لیے ایسی ایک منضبط تالیف کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان الملک المعظم نے السہم المصیب میں بیان کیا ہے۔ (ص ۶۶، طبع دیوبند):

فان ابا حنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ املیٰ محمد ارحمہ اللہ تعالیٰ
کتابی السیر و ذکر فیہا من امور الجہاد و وصایا الامراء و ما ینبغی
لہم فعلہ و ما ینبغی ان یفعلہ اهل الثعور و قسمة الغنائم مالہم سبیقہ
الیٰ جمعہ احد و لم یجمع مثله بعدہ احد.

[امام ابوحنیفہ نے (امام) محمد کو سیر کی دو کتابیں املا کرائیں ان دونوں میں آپ نے جہاد کے مسائل بتائے اور امرائے وہ فرائض جن پر عمل ان کے لیے ضروری ہوتا ہے نیز وہ باتیں جو سرحدی علاقوں کے لوگوں پر واجب ہیں اور غنیوں کی تقسیم کے طریقے بتائے اس انداز میں کہ نہ ان سے پہلے کسی نے اس طرح جمع کیے تھے اور نہ ان کے بعد کوئی اس طرح جمع کر سکا۔]

امام محمد، امام اعظم کے سب سے چھوٹے شاگرد ہیں آپ کے بعد انہوں نے بقیہ علوم کی تکمیل امام ابو یوسف اور امام اوزاعی۔ امام مالک سے کی۔ امام محمد کی پیدائش ۱۳۵ھ کی ہے یعنی تعمیر بغداد کے وقت ۱۴۵ھ میں آپ دس برس کے تھے۔ امام اعظم کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی اور اس وقت شہر کی فضیلتیں تیار ہو چکی تھیں۔ اگر بارہ چودہ برس کی عمر میں امام محمد نے یہ دونوں کتابیں اپنے شیخ کی املا سے لکھیں تو یہ بات ۱۴۷ھ سے ۱۵۰ھ کے درمیان کی ہوگی۔ اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بارہ چودہ برس ہی کی عمر کافی ہوا کرتی تھی اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں رسمی تعلیم مکمل ہو جاتی تھی۔

کتاب الآثار

ظاہر ہے کہ جب ۱۴۳ھ میں فقہ اسلامی کو قید کتابت میں لانے کا کام شروع ہوا تو اس کے لیے بنیادی طریقہ یہی تھا کہ ارشادات نبویہ اور آثار صحابہ کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا جائے اور پھر مسائل کا استخراج ہو، چنانچہ امام اعظم نے اسی کی طرح ڈالی۔ سیوطی کا بیان ہے۔ (تبیض الصحيفة فی مناقب ابی حنیفہ)

من مناقب ابی حنیفہ التی انفرد بها انه اوّل من دون علم الشریعة
ورتبہ ابواباً ثم تبعہ مالک بن انس فی ترتیب الموطا ولم یسبق ابا
حنیفة احد.

[ابوحنیفہ کے مناقب میں یہ اچھوتی بات ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے علم شریعت مدون کیا اور (فقہی مسائل) کے مطابق اس کے باب متعین کیے پھر انہی کی پیروی میں موطا کی ترتیب مالک بن انس نے کی۔ یہ کام ابوحنیفہ سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔]

سیوطی کا یہ بیان محل نظر ہے۔ جب سب نے ایک ہی سال کام شروع کیا اور ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہتے تھے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی

پیروی کی۔ امیر المؤمنین المنصور نے امام مالک کو جس انداز کا فرمان بھیجا تھا۔ اس کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ وہ آثار کو فقہی ابواب میں مرتب فرمائیں اور جو بھی ذہین شخص فقہ کی کتابی تدوین کرے گا اسے لازمًا سب سے پہلے احادیث کو فقہی ابواب پر مرتب کرنا ہوگا۔ امام اعظم کا یہ ذہن رسا تھا کہ یہی طریقہ آپ نے اختیار کیا اور عجب نہیں کہ خود امیر المؤمنین موصوف نے انہیں بھی ایسی ہدایت بھیجی ہو جیسی امام مالک کو بھیجی۔ قیاس کو حدیث پر مقدم نہ رکھنے کی ہدایت میں ایسے ایک فرمان کا اشارہ ملتا ہے اگرچہ تاریخ میں مذکور نہیں لیکن یہ بات سمجھ میں خود بخود آ جاتی ہے کہ سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہنے والے دو ایک آدمی بیک وقت یہ کام شروع کریں اور ان دونوں کا طریقہ ایک ہی ہو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جب تک دونوں کو اوپر سے یکساں ہدایات بیک وقت نہ ملی ہوں۔

امام صاحب کی کتابیں

امام صاحب کو تحریری کام کرنے کے لیے کوفہ میں صرف دو برس ملے اس لیے آپ نے کتاب الآثار کا خاکہ ہی مرتب کیا ہوگا۔ بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مغالطہ سیوطی کو لگا اسے سچ کر دکھائیں اور یہ باور کرانا چاہیں کہ کتاب الآثار امام اعظم کی زندگی ہی میں اور خود انہی کے ہاتھوں کتابی صورت اختیار کر چکی تھی۔ حالانکہ یہ تصور قابل قبول نہیں۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ کتاب السیر ہو یا کتاب الآثار یا امام صاحب کی طرف منسوب کوئی دوسری کتاب ہو ان میں سے کسی ایک کو مدون کتاب کی صورت میں ان کی زندگی میں نہیں دی جاسکتی تھی۔ تدوین و تالیف و تصنیف کا سب کام آپ کے بعد آپ کے عظیم المرتبت شاگردوں کے ہاتھوں انجام پایا اور اس وقت جب وہ خلافت اسلامیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوئے الملک المعظم رحمہ اللہ نے کتاب السیر کی جو تصنیف کی ہے یا سیوطی نے کتاب الآثار کی یہ دراصل تعریف و توصیف امام محمد کی سعی مشکور کی ہے جیسا کہ ہم آگے تصریح کریں گے۔ یہاں ہم ایک اور مغالطہ پر متوجہ کرتے ہیں۔ امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات کا یہ بیان نقل کیا ہے:

كان اصحاب ابى حنيفة الذين دونوا الكتب اربعين رجلاً وكان فى العشرة المتقدمين ابو يوسف، زفر وداود الطائى واسد بن عمرو، ويوسف بن خالد السمى ويحيى بن زكريا بن ابى زائده وهو الذى كان يكتبها لهم ثلاثين سنة.

[ابوحنیفہؒ کے وہ اصحاب جنہوں نے کتابیں مدّون کیں چالیس حضرات تھے ان میں اولین درجہ دس کا ہے ان میں یہ ہیں: ابو یوسف، زفر، داؤد الطائى، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السمى، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائده اور یہی یحییٰ ہیں جو ان کتابوں کو ان کے لیے تیس برس تک لکھتے رہے۔]

اس بیان میں کئی حضرات کے اسماء گرامی رہ گئے ہیں مثلاً عبداللہ بن المبارک (م ۱۸۱ھ) امام حفص بن غیاث (م ۱۵۰ھ) اور امام وکیع بن الجراح (۱۹۸ھ) جو امام شافعی اور امام احمد کے استاد ہیں۔ علامہ شبلی نے مذکورہ بالا روایت نقل کر کے اعتراض کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا جو ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے وہ ۱۵۰ھ تک جو امام اعظم کا سال وفات ہے یہ کام تیس برس کیسے انجام دے سکتے تھے، علامہ شبلی جیسے فرزانہ شخص کو یہ مغالطہ کیوں ہوا اور اس روایت سے انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب تحریری کام ان حضرات نے امام اعظم کے حضور انجام دیا تھا۔ یہاں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ امام صاحب کے اصحاب میں جن حضرات نے تالیف و تصنیف کا کام کیا وہ یہ ہیں۔ ہمارے زمانے کے بزرگ خود ایک بڑے مفکر اسلام صاحب نے بھی امت کو یہی مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ امام صاحب نے ایک غیر سرکاری مجلس قانون ساز بنائی تھی۔ اور تیس برس کے اندر انہوں نے قانون اسلام مدّون کر کے رکھ دیا جو پچاس برس کے اندر خلافت عباسیہ میں سرکاری حیثیت حاصل کر گیا ایک سیدھی بات کو اس طرح کج کر کے غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی۔ روایت میں یہ کہاں ہے کہ امام صاحب کے سامنے بیٹھ کر یہ حضرات آپ کے ارشادات مدّون کیا کرتے تھے۔ بیان تو صرف اتنا ہے کہ امام اعظم کے اہل تلامذہ جنہوں نے فقہ اسلام پر کتابیں لکھیں وہ یہ حضرات تھے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کام امام صاحب کی وفات کے بعد ہوا

اور پھر کچھ استبعاد نہیں رہتا کہ یحییٰ بن زکریا نے میں برس تک ان حضرات کی خدمت میں حاضر رہ کر تصنیف و تالیف میں کتابت کے ذریعے ان کا ہاتھ بٹایا۔ امام صاحب کی طرف منسوب کتابوں کے کئی کئی نسخے ہیں۔ ان میں امام صاحب کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے اقوال کا مذکور ہونا اور روایات کی کمی بیشی خود دلیل ہے کہ یہ تصانیف بعد کی ہیں۔

کتاب الاثار کے نسخوں میں امام زفر، امام یوسف، امام محمد، امام حسن بن زیاد، ولولوی کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر بزرگوار نے اپنے حفظ اپنے درک اور اپنے فقہی رجحان کے مطابق امام اعظم کی مرویات مدون فرمائی ہیں۔ اس طرح یہ تصانیف ان بزرگواروں کی ہیں نہ کہ امام صاحب کی۔ ان میں سب سے اہم امام محمد کی کتاب الاثار ہے۔ اسی طرح سیر کی دونوں کتابیں جو امام اعظم نے، امام محمد کو بغداد میں املا کرائیں تھیں ان کی تالیف امام محمد نے اپنی تمام تصانیف کے بعد کی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔ گویا وہ ہیں تو امام صاحب کے املا پر مبنی مگر انہیں کسی حیثیت سے امام صاحب کی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔ وہ امام محمد ہی کی تصنیف کردہ تسلیم کی جائیں گی۔

امام محمد کی شان یہ ہے کہ کتاب الاثار کی طرح انہوں نے امام مالک سے الموطا کی بھی روایت کی ہے اور اس کا باقاعدہ درس دیتے تھے لیکن اس کتاب کو موطا، امام مالک بروایت امام محمد نہیں کہا جاتا بلکہ موطا، امام محمد کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں محض امام مالک ہی کی مرویات نہیں ہیں بلکہ امام اعظم کا مذہب بھی برابر بیان کیا ہے اور اگر اپنے مذہب کے مطابق امام مالک کی کوئی روایت معمول بہانہ ہو تو حنفی زاویہ نگاہ سے اس کے دلائل دیتے ہیں۔ یہ حال کتاب الاثار کا ہے کہ اس میں امام اعظم کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے یعنی صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کتابیں امام اعظم یا امام مالک کی مرویات پر مبنی خود امام محمد کی اپنی فقہ کی کتابیں ہیں۔ اسی لیے ان کی نسبت انہی کی طرف ہے اور ہونی بھی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ موطا امام مالک اس کتاب کو کہتے ہیں جو یحییٰ المصمودی کی روایت پر مبنی امت میں متداول ہے اور اس میں امام مالک کے علاوہ کسی دوسرے کی روایت نہیں۔

یوں اہل تحقیق کا قول بالکل صحیح ہے۔ امام اعظم کی اپنی کوئی تصنیف دنیا میں نہیں۔ آپ کی فقہی آرا اور آپ کی روایت کردہ احادیث سب کی تدوین آپ کے شاگردوں نے اس وقت کی جب وہ خلافت عباسیہ کے اہم کارکن بن چکے تھے۔

فقہ حنفی

امام یوسف اور امام محمد کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد مطلق تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا بنیادی علم چونکہ امام اعظم کے فیوض پر مبنی تھا۔ اس لیے لازماً اس کا رنگ حنفی رہا۔ لیکن انہوں نے جگہ جگہ اپنے شیخ سے اختلاف بھی کیا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر کوئی خاص مکتبہ نہ تھا بلکہ وہ عالم گیر فقہی نظام مرتب کر رہے تھے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے:

الدين والفقه والعلم انتشر في الامة عن اصحاب ابن مسعود
واصحاب زيد بن ثابت، واصحاب عبدالله بن عمرو واصحاب
عبدالله بن عباس. فعلم الناس عامة عن اصحاب هؤلاء الاربعة فاوا
اهل المدينة فعلمهم عن اصحاب زيد بن ثابت وعبدالله بن عمرو
اما اهل مكة فعلمهم عن اصحاب عبدالله بن عباس واما اهل
العراق فعلمهم عن اصحاب عبدالله بن مسعود.

[دین، فقہ اور علم اس امت میں اصحاب ابن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابتؓ، اصحاب
عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبداللہ بن عباسؓ کے ذریعے پھیلا۔ عام طور پر لوگوں کا علم
انہی چاروں کے اصحاب کے فیوض پر مبنی ہے۔ اہل مدینہ کو علم حضرت زید بن ثابتؓ
اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اصحاب سے ملا۔ اہل مکہ کو علم حضرت عبداللہ بن عباسؓ
کے اصحاب سے ملا اور اہل عراق کو علم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب سے ملا۔]
پچھلے صفحات میں گزر چکا کہ علما کوفہ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ نے ان اصحاب

سے بھی پورا فیض لیا جو کونے میں تشریف لائے اور پھر یہ حضرات مدینے بھی حاضر ہوتے رہتے تھے تاکہ حضرت امیر المؤمنین عمر الفارق الاعظمؓ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ الکبریٰؓ سے بھی اکتساب علم کریں۔ اسی طرح امام اعظمؒ نے اپنے کو فی اساتذہ کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد حضرت عطاء بن ابی رباح سے بھی استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں قاضی شریح (۸۰ھ) کے سلسلے میں آپ کو امام اہل الرائی سیدنا معاذ بن جبلؓ سے بھی فیض پہنچا۔ اپنے امام اور شیخ کے اسی منہاج پر ان کے شاگرد بھی چلے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے امام اوزاعیؒ سے فقہ شام پر عبور حاصل کیا اور امام محمدؒ نے امام ابو یوسفؒ کے علاوہ حضرت امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ سے پورا پورا فیض لیا غرض یہ ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہا جاتا ہے وہ دراصل فقہ حجاز، فقہ شام اور فقہ عراق پر مبنی اسلام کا اولین فقہی نظام ہے جو امام اعظمؒ کے تلامذہ نے اپنے امام کے طریقہ پر مدون کیا، مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ۔ اسی لیے امت میں فقہ حنفی سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور چونکہ یہ عظیم الشان کام خلفائے عباسیہ کی امامت میں انجام دیا گیا اس لیے تمام عالم اسلام کا مقبول ترین فقہی نظام قرار پایا۔

یہ ہے امیر المؤمنین عبداللہ المصنوع کا وہ کارنامہ جس کے سبب یہ امت ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور قیامت تک جتنے فقہاء، علماء و صلحا اور عوام اس فقہ پر عمل کریں گے ان کے اعمال کے ثمرات و انوار سے امیر المؤمنین موصوف کے درجات بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔ من سن سنة حسنة فله اجرها واجرم من عمل بهار ”جس نے کسی نیک کام کی نہاد رکھی اسے اس کا ثواب ملے گا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل پیرا ہوں گے۔“

مودودی صاحب جیسے لوگوں نے یہاں یہ خلاف واقعہ بات کہی ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین خود امام اعظمؒ نے ایک غیر سرکاری مجلس آئین ساز بنا کر اپنے شاگردوں کے تعاون سے اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی وہاں انہوں نے یہ لغو بات بھی کہی ہے کہ یہ فقہ اپنی پشت پر کسی سرکاری قوت کے بغیر امت میں مقبول ہو گئی۔ جو لوگ صحابہؓ کے اجماع سے منہ موڑ کر اپنے خود ساختہ اصول و قواعد کے تحت اموی اور عباسی خلافتوں کی حجت پر حرف لانا چاہتے ہیں اور

واقعات سے آنکھ بند کر کے یہ خیالی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں کہ خلفائے اسلام، علما اور فقہا امت کے مابین تعاون و احترام و یک جہتی کا فقدان تھا وہ دعوت محمدیہ کے فروغ اور مملکت اسلامیہ کے ارتقا کو غلط رنگ میں پیش کر کے یوں امت کے قلوب و اذہان کو اسلاف کرام کی طرف سے ملکر کرنے کی سعی نامشکور کی معصیت میں مبتلا ہیں ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ کوئی تشریفی نظام اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے عملاً نافذ کیے جانے کی خاطر اس کی پشت پر سیاسی قوت نہ ہو اور وہ قوت ایسی ہونی چاہیے کہ قوم اس پر صمیم قلب سے اعتماد کرتی ہو۔ قرآن مجید میں بھی احکام اسی وقت نازل ہوئے جب مدینے میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور آنحضرت ﷺ کو نفاذ شریعت کی سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ جو سیاسی نظام قوم میں نامقبول ہوگا اور ملت اسلامیہ مجموعی حیثیت سے اس سیاسی نظام کو دل کی گہرائی سے اپنا ملی نظام نہیں سمجھے گی تو ناممکن ہے کہ اس حکومت کے جاری کردہ قوانین دائمی طور پر رائج ہو سکیں جو نبی حکومت ہٹے گی اس کے قوانین بھی منسوخ ہو جائیں گے۔ پوری تاریخ انسانیت اس پر گواہ ہے۔

لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ حکومتیں بدلیں اور قسم قسم کے سیاسی مدد و جزر سے یہ امت دوچار ہوئی مگر وہ فقہی نظام جو امیر المومنین المنصور اور ان کے اخلاف کرام کی نگرانی اور سرپرستی میں مدون ہوا۔ وہ آج تک اسی طرح مقبول چلا آ رہا ہے۔ یہ کیسی کھلی دلیل ہے کہ اموی اور عباسی خلافتیں ہم عصر حکومت کے نزدیک صحیح معنی میں دعوت محمدیہ کی نمائندہ حکومتیں تھیں اور امت کی اطاعت اور ان سے دلی وابستگی کو تقاضائے ایمان جانتی تھی۔ اسی لیے وہ تمام تحریکیں ناکام ہوئیں جو ان خلافتوں کی دینی اور آئینی حیثیت ختم کرنے کے لیے جاری کی گئیں اور وہ سب افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے جو اپنے تخریبی عزائم کے تحت کسی متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت میں کھڑے ہوئے۔ لوگ اپنی تخریبی عزائم کے تحت کچھ بھی کہتے رہیں مگر تاریخی حقیقت یہی ہے کہ دین مبین اپنے تمام (کلیات) و جزئیات کے ساتھ عہد بہ عہد نظام خلافت ہی کے تحت علما و فقہا امت نے مدون کیا اور یہ اسی باہمی تعاون و اعتماد و احترام کا نتیجہ تھا جو حکومت قائمہ اور فقہا امت کے مابین ہمیشہ قائم رہا۔

چونکہ ہمارے پیش نظر صرف امام ابوحنیفہ کے مواقف ہیں اور ان کے ذیل میں آپ کے تلامذہ کے، اس لیے دوسرے ائمہ کا ذکر آگیا ہے یا آگے آئے تو محض ضمناً ہوگا۔ سطور بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ:

۱۔ امام ابوحنیفہ پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے اور فرقہ وارانہ تصورات کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ وحدت امت برقرار رکھنے کے لیے حکومت قائمہ سے اپنے تعلقات یگانگت پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اموی اور عباسی خلافتیں صحیح بنیاد پر قائم تھیں اور یہ ان کا فرض تھا کہ امام جماعت سے پوری طرح وابستہ رہیں اور ان تمام حرکتوں سے اپنا دامن بچائے رکھیں جن سے وحدت پاش پاش ہوتی ہو اور امت کا کلمہ متفرق ہوتا نظر آئے ان کا یہ مذہب شروع سے تھا اور آخر تک رہا۔ یہی مذہب انہیں اپنے اساتذہ سے ملا تھا اور اسی کی تلقین انہوں نے اپنے تلامذہ کو کی۔ جس پر انہوں نے عمل کیا اور خلافت قائمہ کے دست و بازو بنے۔

۲۔ حضرت امام اعظم کے بارے میں زید بن علی بن الحسنؒ وغیرہ نے اموی خلافت میں اور محمد الارقط بن عبداللہ حسنی وغیرہ نے عباسی خلافت میں جو خروج کیا۔ امام صاحب اور دوسرے ہم عصر ائمہ نے ان خروجوں اور بغاوتوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھا اور وہ سب روایتیں عقلاً و نقلً باطل ہیں جو ہوا پرست لوگوں نے اس ضمن میں بیان کی ہیں۔

۳۔ حکومت قائمہ اموی ہو یا عباسی قواعد دینیہ کے تحت تمام علماء و فقہاء عصر کا پورا احترام کرتی تھیں۔ ایسی تمام روایات صدیوں بعد کے لوگوں کی خود ساختہ ہیں جن سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلفاء اور علماء کے مابین دوئی تھی، اور وہ ایک دوسرے کے خلاف حریفانہ اور معاندانہ جذبات رکھتے تھے، یہ کرامت ان خلفاء کی ہے کہ ہر ایسی روایت اپنا بطلان خود ثابت کر دیتی ہے۔

تلامذہ امام

امام ابوحنیفہ نے جس طرح ہدایات ربانیہ اور فرمودات نبویہ کے مطابق خلیفہ عصر سے اپنے تعلقات یگانگت استوار رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا اپنا فریضہ ملی جانا اسی طرح ان کی اجلہ تلامذہ کا طریقہ کار تھا، اور اسی باہمی ربط و صفاء کی برکت تھی کہ امت مسلمہ نے اپنے ارتقائی منازل طے کیے۔

۱۔ امام زفر: امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد اور جانشین امام زفر ہیں۔ جو امام صاحب کی زندگی میں بصرے کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور اس خدمت سے وہ اس وقت مستعفی ہوئے جب اپنے شیخ کی وفات پر ان کی جانشینی کی ذمہ داری ان پر آ پڑی۔ جس کے فرائض انھوں نے اپنی وفات تک اٹھ برس انجام دیے۔ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں ان کے قاضی بننے کی دلچسپ روئداد نقل کی ہے:

”جب حکومت نے انھیں بصرے کا قاضی مقرر کیا (یعنی امیر المومنین المنصور نے) تو امام ابوحنیفہ نے ان سے فرمایا: ہمارے اور اہل بصرہ کے مابین جو اختلافات ہیں اور وہ لوگ جو ہم سے حسد کرتے ہیں، اس کے پیش نظر مجھے امید نہیں کہ تم اپنے فرائض کامیابی سے انجام دے سکو گے۔ لیکن امام زفر تو کلاً علی اللہ وہاں گئے اور اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ بصری علماء ان کے پاس آنے لگے اور مناظرے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب امام زفر مخاطب کو فقہی مسائل میں قائل کر لیتے تو فرماتے: یہ ہے ابوحنیفہ کا قول۔ لوگ تعجب سے کہتے: ابوحنیفہ کے علم میں اتنی گہرائی ہے؟ تو آپ فرماتے: اس سے بھی زیادہ۔“ (ابوزہرہ، ابوحنیفہ، ص ۲۱۸)

یوں رفتہ رفتہ وہ تعصب جاتا رہا۔ اب حکومت کے ساتھ تعاون اور امیر المومنین موصوف کی فرماں برداری کی سب سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ امام زفر نے اس علاقے کا قاضی بننا منظور کر لیا۔ جہاں کا ماحول ان کے خلاف تھا۔ یعنی انھوں نے اسے اپنا دینی فریضہ جانا

کہ حالات موافق ہوں یا مخالف امیر المومنین کا فرمان بجالانا چاہیے۔

۲۔ امام ابو یوسف: امام زفر کے بعد درجہ امام یوسف کا ہے امیر المومنین المہدی عباسی نے آپ کو شرقی بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ پھر یہی عہدہ ان کے بعد امیر المومنین الہادی کے زمانے میں رہا۔ امیر المومنین ہارون الرشید کے عہد زریں میں آپ کو قاضی القضاۃ بنادیا گیا۔ شیخ ابوزہرہ کہتے ہیں:

ولقد ولی القضاء لثلاثة من الخلفاء للمہدی ثم للہادی ثم للرشید
ويقول ابن عبد البر كان الرشيد يكرمه ويجلّه وكان عنده خطيبا
مكينا۔ (ابوحنیفہ، ص ۱۹۶)

[وہ تین خلفاء کی طرف سے قاضی رہے یعنی المہدی، الہادی اور الرشید کے ابن عبد البر کہتے ہیں کہ الرشید ان کا بہت عزت و احترام کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں بہت مقتدر اور صاحب اختیار تھے۔]

اس سے پہلے اسلام میں قاضی القضاۃ کا کوئی عہدہ نہ تھا اور یہ شرف امام ابو یوسف کا ہے کہ آپ ہی سب سے پہلے قاضی القضاۃ بنے۔ اسی عہدے کی برکت تھی کہ تمام عالم اسلام میں امام اعظم کے تلامذہ نے اسلام کا عدلیہ فقہ حنفی منظم کیا۔ کیونکہ صحابہ کرام سے لے کر اپنے عصر تک کے تمام فقہی مکتبہ ہائے فکر سے اس کی تدوین میں پورا پورا استفادہ کیا گیا تھا۔ اسی لیے ہر علاقے کے لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ اس اجماعی فقہ پر عمل درآمد کر لیا۔ اسی دوران آپ نے وہ معرکتہ الاراکتاب لکھی جو آپ کی کتاب الحراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تالیف امیر المومنین ہارون الرشید کی فرمائش پر تھی۔ اس کے مقدمے میں خود فرماتے ہیں:

ان امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سألنی ان اضع کتاباً جامعاً
[امیر المومنین نے، اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو، مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں
ایک جامع کتاب لکھوں۔]

گویا جس طرح امیر المومنین المصنوع کی فرمائش پر امام مالک نے موطأ کی تدوین کی

اور امام اعظم نے سیر کی کتاب املا کرائی اسی طرح امیر المومنین ہارون الرشید کے فرمان کی پزیرائی میں امام ابو یوسف نے کتاب الخراج لکھی۔ اسی عہد مبارک میں امام محمد نے اپنی عظیم الشان کتابیں لکھیں امام یوسف کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی نام یعقوب تھا سلسلہ نسب یوں ہے: یعقوب ابو یوسف بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن حبہ بنجیلی امام ابو یوسف کے فرزند یوسف اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں عہدہ قضا پر مقرر تھے۔

۳۔ امام محمد: امام محمد نے اپنے شیخ امام اعظم کے بعد امام ابو یوسف، امام مالک اور امام اوزاعی سے علوم کی تکمیل کی۔ پھر امیر المومنین ہارون الرشید کے ایک قاضی مقرر ہوئے اور اسی منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنی کتابیں لکھیں اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس کی تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے امام محمد اور امام کسائی نے ۱۸۹ھ میں ایک ہی دن وفات پائی۔ امیر المومنین ہارون الرشید نے دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی اور سرکاری اعزاز کے ساتھ ان دونوں عظیم ہستیوں کی تدفین کے بعد حسرت سے فرمایا: ”آج میرے ہاتھوں فقہ اور خود دونوں زیر زمین ہیں۔“ امام محمد کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ شیبان سے نسب ولا کی بنا پر محمد الشیبانی کہلائے۔

۴۔ ابن المبارک: امام اعظم کے خاص شاگرد ہیں۔ صاحب تصنیف ہونے کے علاوہ ایسے جامع الکمالات تھے کہ رہتی دنیا تک یہ امت آپ پر فخر کرے گی۔ امیر المومنین ہارون الرشید کے ساتھ آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ایک مرتبہ ۷۹ھ میں آپ نے طرطوس کے جہاد میں شرکت کی۔ جہاد بالقلم اور جہاد بالنفس سے آگے بڑھ کر جب اپنی امام کی معیت میں جہاد بالسیف کیا اور اس کی عظمت و برکت اور انوار آپ پر منکشف ہوئے تو اپنے اور امیر المومنین کے عزیز ترین دوست حضرت فضیل بن عیاض کو حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے:

یاعابد الحرمین لو ابصرتنا	لعلمت انک فی العبادۃ تلعب
من کان یخضب خدہ بد موعہ	فبحو رنابد مائنا نتخضب
اؤ کان یتعب حیلہ فی باطل	فخیولنا یوم الکریہۃ تتعب

ريح العبير لكم ونحن عبرنا رهج السسابك والغبار الاطيب
ولقد اتانا عن مقال نبينا قول صحيح صادق لا يكذب
لا يستوى وغبار خيل الله في انف امراء ودخان نار تلهب
هذا كتاب الله ينطق بيننا ليس الشهيد بميت لا يكذب

[اے حرمین میں عبادت کرنے والے اگر آپ ہمیں دیکھتے تو جان لیتے کہ آپ کی عبادت ایک کھیل ہے۔ اگر کوئی اپنے رخسار آنسوؤں سے رنگتا ہے۔ تو ہم اپنے خون سے اپنے گلے رنگتے ہیں۔ یا اپنے گھوڑوں کو فضول کاموں میں تھکاتا ہو۔ تو ہمارے گھوڑے میدان کارزار میں تھکائے جاتے ہیں۔ تمہارے لیے خوشبو گلال کی ہے اور ہمارا گلال اڑتی ہوئی مٹی اور پاک غبار۔ ہمیں ہمارے نبی ﷺ کے ارشادات میں یہ صحیح اور سچا قول پہنچا ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اللہ کی راہ میں گھوڑوں سے اٹھتا ہوا، غبار جو ایک آدمی کی ناک میں جائے گا اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں دونوں یک جہت نہیں ہو سکتے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے جو فیصلہ سناتی ہے کہ شہید مرتا نہیں اور یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی۔] (امام سبکی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۱۱، ص ۱۵۱)

امیر المؤمنین موصوف کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات پر مجلس عزاء منعقد کی، لوگ آکر امام ابن المبارک کی وفات پر تعزیت پیش کرتے تھے۔ امام ابن المبارک کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں آپ نے فرقہ بازوں کے عقائد و اعمال سے بیزاری ظاہر کر کے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی کو ضرورت دین میں بتایا ہے اور یہ کہ خلافت ہی کے ذریعے دین مبین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اس طویل قصیدے کے دو شعر یہ ہیں:

الله يدفع بالسلطان معضله عن ديننا رحمة منه ورضوانا
لولا الأئمة لم تامن لنا سبل وكان اضعفنا هبا لا قوانا
[اللہ تعالیٰ خلیفہ وقت کے ذریعے اپنی رحمت اور رضا سے ہمارے دین کی ہر مشکل

رفع فرماتا ہے۔ اگر خلفاء اسلام نہ ہوتے تو ہمارے لیے ہمارے راستے محفوظ نہ رہ سکتے اور ہمارے کمزور لوگ ہمارے زبردستوں کا شکار بن جاتے۔ [یعنی ہماری دینی اور دنیوی تمام تر قیاں، ملت کا تحفظ و ارتقاء اور ظاہری و باطنی فتنوں کے شر سے محفوظ رہنے کی سبیل نظام خلافت کے استحکام پر مبنی ہے۔

۵۔ قاسم بن معن: یہ امام اعظم کے اجلہ تلامذہ میں ہیں حضرت ابن مسعودؓ کی اولاد میں تھے۔ امام صاحب کی زندگی ہی میں امیر المومنین المنصور کی طرف سے کوفہ کے قاضی رہے۔ مگر منصب کی تنخواہ قبول نہیں کی اور رضا کارانہ فرائض انجام دیے۔ امام اعظم ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے: انتہی مسار قلبی و جلاء حزنی (تم میرے دل کے سرور ہو اور دوائے قلب محزون) تمام اصحاب السنن کے مشائخ میں ہیں بعض کے نزدیک ۱۷۵ھ میں وفات پائی اور بعض نے سال وفات ۱۵۵ھ بتایا ہے۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور صحیح سال وفات ۱۵۵ھ ہی ہے۔

۶۔ حماد بن ابی حنیفہ: امام اعظم کے یہ فرزند جلیل القاسم بن معن کے بعد کوفہ کے قاضی ہوئے۔ (م ۱۷۰ھ) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ۔

۷۔ اسماعیل بن حماد: امام صاحب کے یہ پوتے اول مشرقی بغداد کے قاضی رہے اور پھر بصرے اور رتے کے (م ۲۱۲ھ) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ۔

۸۔ حفص بن غیاث: یہ امام اعظم کے تلامذہ میں ہیں، سفیان ثوری اور یوسف سے بھی استفادہ کیا۔ ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا، ان میں امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام علی المدینی جیسے بزرگوار ہیں۔ امیر المومنین ہارون الرشید کے عہد مبارک میں کوفہ کے قاضی تھے۔ (۱۹۴ھ)

۹۔ حسن بن زیاد لؤلؤی: یہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ کچھ دن کوفہ کے قاضی رہے پھر مستعفی ہو گئے۔ (م ۲۰۴ھ)

۱۰۔ امام اسد بن عمرو: یہ بھی امام اعظم کے اجلہ تلامذہ میں ہیں۔ ان کے متعلق امام ذہبی

فرماتے ہیں: صحب اباحنیفہ وتفقه علیہ من اهل الکوفہ فقدم بغداد وتولی قضاء الشرقیہ (اہل کوفہ میں سے انھوں نے ابوحنیفہ کی صحبت اختیار کی اور فقہ پر عبور حاصل کیا پھر بغداد آئے اور شرقی بغداد کے قاضی بنے۔) بعد عہد امیر المومنین ہارون الرشید ۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

اصحاب امام مالک

خلفائے کرام کے ساتھ امام اعظم کے باہمی روابط اور بیان ہوئے۔ ان کے عظیم المرتبت تلامذہ کا خلافت عباسیہ کے اہم مناصب پر فائز ہو کر فقہ اسلامی کی تدوین کرنا بھی بیان ہو چکا۔ اسی طرح امام مالک اور خلفاء عباسیہ کے گہرے روابط کا حال بھی لکھا جا چکا۔ اب ہم یہاں صرف چند مالکی حضرات کے اسمائے گرامی لکھتے ہیں۔

۱۔ ابو مصعب زہری احمد بن ابی العوف المدنی: امام مالک کے خاص شاگرد ہیں۔ امام نسائی کے علاوہ صحاح کے تمام مصنفوں کو آپ سے بلا واسطہ فیض ہے۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔ مدینے کے قاضی تھے۔ امام ذہبی ان کے متعلق فرماتے ہیں: احدث الاثبات وشيخ اهل المدينة وقاضيههم ومحدثهم۔ [مسلم الثبوت حفاظ میں ہیں۔ اہل مدینہ کے استاد تھے ان کے قاضی تھے اور ان کے سب سے بڑے محدث تھے۔]

۲۔ حارث بن سکین: امام مالک کے شاگرد، امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں مصر کے عہدہ قضا پر فائز تھے۔

۳۔ عبد اللہ بن الحکم: یہ بھی امام مالک کے شاگرد ہیں۔ مصر میں انتظامیہ کے اہم عہدے پر تھے۔ بعد عہد امیر المومنین المتوکل علی اللہ۔

۴۔ امام شافعی: آپ مجتہد مطلق ہیں۔ امام مالک کے شاگرد، امام اعظم کے تلمیذ خاص اور وکیع بن الجراح کے بھی۔ امام محمد سے آپ نے بہت استفادہ کیا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں: اما الشافعی فاحتج بمحمد بن الحسن فی الحديث (امام شافعی حدیث کے بارے میں امام محمد کی روایات کو حجت سمجھتے ہیں)۔ (مناقب ابی حنیفہ و صاحبیہ) خطیب بغدادی

نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے (تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۱۷۶): امن الناس على في الفقه محمد بن الحسن (تخصيل في الفقه میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان محمد بن الحسن کا ہے)۔ حافظ سمعانی نے بلوغ الارمانی میں آپ کا یہ قول نقل کیا ہے: اعانني الله برجلين بابن عيينه في الحديث و بمحمد في الفقه (اللہ تعالیٰ نے دو بزرگوں کے ذریعے میری مدد فرمائی حدیث میں ابن عیینہ کے ذریعے اور فقہ میں محمد کے ذریعے)۔

امیر المومنین ہارون الرشید کے قاضیوں میں امام شافعی بھی ہیں اور آپ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے سلسلے کے سیکڑوں حضرات صدیوں تک خلافت عباسیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اگر ان سب کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک مجلد ہو۔ امیر المومنین المتوکل علی اللہ کو آپ سے خاص عقیدت تھی اور اتنی کہ بعض لوگ انھیں شافعی المذہب کہتے ہیں جو صحیح نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک خلفاء کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے البتہ امیر المومنین القادر باللہ شافعی المذہب تھے اور شوافع کے صاحب تصنیف ائمہ میں ہیں (طبقات الشافعیہ الکبریٰ، ج ۳، ص ۱۸) اسی طرح امیر المومنین المسترشد باللہ بھی شافعی المسلک تھے۔ نیز بعض دوسرے خلفاء امیر المومنین المستنصر باللہ اور امیر المومنین الناصر لدین اللہ حنبلی تھے۔

۵۔ امام احمد: آپ بھی مجتہد مطلق تھے۔ امام ابو یوسف اور امام وکیع ابن جراح سے رشتہ تلمذ تھا۔ امام ذہبی نے مناقب میں آپ کا یہ بیان نقل کیا ہے: اول ما كتبت الحديث اختلفت الي ابی يوسف القاضوا فكتبت عنه ثم اختلفت بعد الي الناس [سب سے پہلے میں نے جو احادیث لکھیں تو ان کے لیے قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان سے احادیث نقل کی پھر دوسرے حضرات کے پاس گیا۔] اسی طرح امام محمد اور امام شافعی سے آپ نے اکتساب فیض کیا ہے۔ امیر المومنین المعتمد باللہ سے خلق قرآن کے سلسلے میں آپ کا اختلاف ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں لوگوں نے روایات کا ایک انبار لگا دیا ہے جن پر تنقید سے فی الحال ہمیں غرض نہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ اس اختلاف کے بعد آپ سات برس امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں زندہ رہے اور اپنے مذہب کی تلقین کی اور وہ مذہب وہ نہیں تھا جو

لوگوں نے آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ آپ کا مذہب یہ تھا کہ کلامی مسائل میں گفتگو بے ضرورت اور بدعت۔ یعنی آپ کے نزدیک قرآن مجید کو غیر مخلوق کہنا بھی بدعت تھا اور مخلوق کہنا بھی آپ اس اعتقاد کو کافی و شافی بتاتے تھے کہ قرآن کلام اللہ ہے اور بس۔ یہ موضوع بھی طویل ہے اور ہمارے ائمہ نے اس پر کافی بحث کی ہے اور ان لوگوں کا قول غلط بتایا ہے جو کہتے ہیں کہ امام احمد قرآن مجید کو غیر مخلوق کہتے تھے اور کہنے والے کو کافر جانتے تھے۔ ملاحظہ ہو طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۵، ص ۸۰ بذیل مادہ امام عز الدین عبدالعزیز بن عبدالسلام قدس سرہ۔

فرماتے ہیں: واحمد بن حنبل وفضلاء اصحابہ و سائر علماء السلف براء الى الله مما نسبوه اليهم واختلفوه عليهم. [احمد بن حنبل اور ان کے فاضل اصحاب اور تمام علماء سلف اس چیز سے بری ہیں جو لوگوں نے ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور ان پر بہتان باندھے ہیں....]

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ سے امام احمد کے تعلقات بہت خصوصی تھے اور اکثر امور میں وہ آپ کی رائے لیے بغیر کوئی حکم نافذ نہیں کرتے تھے۔ آپ ہی کی رائے کے مطابق امیر المؤمنین موصوف نے کربلاء کی مصنوعی قبریں جو عرصہ دراز کے بعد انکل پچو بنائی گئی تھیں وہاں کی بدعات اور شرکانہ رسوم کی بنا پر منہدم کرادی تھیں۔ اسی مذہب کے مطابق سلطان ابن مسعود نے حرمین شریفین کی قبریں مسمار کرادیں۔ یہی مذہب امیر المؤمنین علیؑ کا تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور یہی مذہب سیدنا عمرو بن العاصؓ کا تھا آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی قبر پر نرم نلکریاں ڈال دی جائیں کہ رفتہ رفتہ قبر معدوم ہو جائے۔ دنیا دار الفنا ہے یہاں ثبات کی کوشش سعی لاحاصل ہی رہے گی۔

دیگر ائمہ

امام اعظم ان کے تلامذہ اور پھر ان کے وہ تلامذہ جو خود صاحب مذہب اور خود مجتہد ہیں ان کے اور خلافت قائمہ کے مابین روابط اور باہم تعاون و احترام کا یہ مختصر تبصرہ یوں تو بالکل

کافی ہے اور اس کا بین ثبوت کہ خلافت قائمہ اور ائمہ مذاہب کے مابین دوئی نہ تھی بلکہ امام المسلمین کی قیادت میں امت کا وحدانی نظام تھا جس کے تحت ہر مومن اپنی جگہ اپنے اپنے دائرے عمل میں حضور اکرم ﷺ کی دعوت کی آب یاری میں مصروف رہتا تھا اور وحدت امت کا تصور دل سے محو نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی حیثیت سے بھی سب باطل فرقے اتنی حیثیت نہ بنا سکے کہ عددی اعتبار سے امت کے سوا دا عظم کے حریف ہو سکیں۔

اب ہم چند اور اکابر امت کا ذکر تازہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے نظام خلافت کی دینی حیثیت اور خلفائے اسلام سے روابط کا استحکام ایک فریضہ ملّیہ جانا۔

۱۔ حضرت فضیل بن عیاض: مشاہیر اولیاء اللہ میں ہیں۔ اکابر عباد اور زہاد میں آپ کا شمار ہے۔ اہل حدیث کے ہاں آپ کو ثقہ ثبت امام (ثقة اور قابل استناد امام) کہا جاتا ہے۔ آپ امیر المومنین ہارون الرشید کے خاص احباب میں تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ نے امیر المومنین کو تشریف لاتے دیکھا تو عبدالرزاق سے فرمایا: (تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۴، طبع مصر)

قال عبدالرزاق كنت مع الفضيل بكمة فمر هارون فقال فضيل الناس يكرهون هذا وما في الارض اعزّ عليّ منه.

[عبدالرزاق کہتے ہیں، میں فضیل کے ساتھ مکے میں تھا کہ ادھر سے ہارون کا گزر ہوا تو فضیل نے فرمایا لوگ انھیں پسند نہیں کرتے۔ مگر میرے نزدیک روئے زمین پر ان سے زیادہ لائق تعظیم و محبت کوئی نہیں۔]

عبدالرزاق سے یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ وہ شیعہ خیال کے شخص تھے اگرچہ روایات ان کی بعض شرائط کے ساتھ قبول کر لی جاتی ہیں۔ مگر اپنے مخصوص تصورات کی بنا پر امام جماعت کی ان کی نگاہوں میں چنداں حرمت نہ تھی ممکن ہے حضرت فضیل کے اس ارشاد سے ان کی کچھ اصلاح ہو گئی ہو۔

۲۔ حافظ الطحطاوی بن موسیٰ الانصاری: امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے زمانے میں نیشاپور

کے قاضی تھے۔ امام مسلم، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ کے استاد امام ذہبی فرماتے ہیں: کان من ائمة الحديث وصاحب سنة. (وہ حدیث کے ائمہ میں ہیں اور عالم سنت)۔ (م ۲۴۴ھ)

۳۔ حافظ ابوبکر بن ابی الدنیا: بالولا اموی قریشی ہیں، امام بخاری اور امام داؤد کے شاگرد اور امام ابن ماجہ کے استاد ہیں (م ۲۸۱ھ) امیر المؤمنین المعتمد باللہ عباسی اور دوسرے نو بہا لان خانوادہ خلافت کے اتالیق رہے اور ان کی تربیت کی۔

۴۔ امام اوزاعی: ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں بڑی تفصیل سے مرجع اہل شام امام اوزاعی اور امیر المؤمنین المنصور کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (ج ۶، ص ۱۳۵) مگر اس تفصیل میں جو احادیث حضرت اوزاعی نے بیان کی ہیں ان کی صحت مشکوک ہے اور بعض بالکل بے پایہ ہیں۔ غالباً کسی راوی نے تصرف کیا ہے۔ بہر حال امام اوزاعی فرماتے ہیں:

بعث الی ابو جعفر امیر المؤمنین وانا بالساحل فاتیته فلما وصلت الیه وسلمت علیہ بالخلافه رد علی و استجلسنی ثم قال مالذی ابطاع بک عنایا اوزاعی؟ قلت وما الذی ترید یا امیر المؤمنین قال ارید الاخذ عنکم و الاقتباس منکم. قلت یا امیر المؤمنین انظر ولا تجهل شیئاً مما اقولک قال و کیف اجهله وانا اسالک عنه وقد وجهت فیہ الیک و اقد متک له؟ قلت ان تسمعه ولا تعمل به، قال فصاح بی الربیع واهوی بیده الی السیف فانتهره المنصور وقال هذا مجلس مثوبة عقوبة. فطابت نفسی و انبسط فی الکلام.

[مجھے ابو جعفر المنصور نے طلب کیا میں اس وقت ساحل پر تھا، چنانچہ ان کے پاس گیا جب قریب پہنچا اور خلافت کے آداب بجالایا تو انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا، اپنے پاس بیٹھایا اور فرمایا اوزاعی آپ کو ہمارے پاس آنے سے کس چیز نے روکا تھا؟ میں نے عرض کیا امیر المؤمنین آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں فرمایا میں آپ سے کچھ حاصل کرنا اور فیض اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا امیر المؤمنین غور کیجیے اور

جو کچھ میں آپ سے کہوں اس سے غافل مت ہو جائیے۔ فرمایا میں غافل کیسے ہوں گا جب کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں آپ کے پاس قاصد بھیجا اور آپ کو یہاں بلایا۔ میں نے کہا ”یوں کہ آپ جو نہیں اس پر عمل نہ کریں“ اس پر بیچ نے مجھے ڈانٹا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا تو المنصور نے انھیں جھڑکا ”یہ محفل جزا کی ہے سزا کی نہیں“ تو مجھے اطمینان ہوا اور کھل کر بات کی۔]

جب مجلس ختم ہو گئی اور میں رخصت ہونے لگا تو امیر المومنین نے فرمایا:

شکرت لک نصیحتک و قبلتها بقبول واللہ الموفق للخیر
والمعین علیہ وبہ استعین وعلیہ اتوکل و هو حسبی ونعم الوکیل
فلا تخلنی عن مطالعتک ایای بمثلها فانک المقبول غیر التهم فی
الضحیة. قلت افعل ان شاء اللہ.

[میں آپ کی نصیحت کا شکر گزار ہوں اور میں نے اسے دل سے قبول کیا اللہ تعالیٰ ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہے اور وہ اس پر مدد کرنے والا۔ میں اسی سے مدد طلب کرتا ہوں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی میرے لیے کافی ہے اور بہترین کارساز ہے آپ اپنی توجہات سے مجھے محروم مت رکھیے گا کیونکہ خیر خواہی میں آپ مقبول ہیں اور مہتمم نہیں۔ میں نے کہا ان شاء اللہ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔]

چنانچہ دونوں بزرگوں میں مراسلت ہوتی رہتی تھی اور امیر المومنین موصوف ان کی سفارشات قبول فرماتے تھے۔ یہاں اس کی تصریح نہیں کی کہ امیر المومنین نے دینی کتابیں لکھنے پر انھیں متوجہ کیا لیکن یہ کام آپ نے اسی ملاقات کے بعد کیا تھا۔ جیسا کہ امام ذہبی نے ۱۴۳ھ میں ان کے کام کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مذہب اوزاعی کے ایک جلیل القدر عالم تھے حافظ رحیم عبدالرحمان بن ابراہیم بن عمرو بن میمون (م ۲۴۵ھ) امام ذہبی نے ان کے متعلق لکھا ہے: ”حافظ حدیث، فقیہ کبیر ابو سعید اموی بطریق ولا دمشق کے رہنے والے تھے۔ مذہب اوزاعی کے متبع اور شام کے محدث، امام ترمذی کے علاوہ صحاح کے تمام مؤلف ان کے شاگرد

ہیں۔ یہ اموی امام پہلے اردن اور فلسطین میں عرصہ دراز تک قاضی رہے۔ اس کے بعد آپ کو امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ نے مصر کا قاضی القضاۃ بنایا۔ لیکن یہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے آپ وفات پا گئے۔

غرض یہ ہے کہ اہل ہوا نے خلافت اسلامیہ اور علماء و فقہاء امت کے مابین منصب خلافت کے استخفاف کے لیے جو روایتیں وضع کی ہیں۔ اکابر علماء و خلفاء پر بہتان باندھے ہیں اور صدیوں بعد کے مصنفوں نے ان روایات کو بے احتیاطی یا تعصب کے سبب اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے تمام ائمہ خلیفہ عصر کے ساتھ تعاون اور ان کے فرامین کی پذیرائی کو ضرورت دین میں سمجھتے تھے جیسا کہ حضور ﷺ نے امت کو وصیت کی ہے۔ اور آپ کے بیسویں ارشادات صحاح میں مروی ہیں۔ جملہ ازاں یہ ارشاد مبارک ہے (صحیح بخاری، کتاب الشتم) حضرت حذیفہؓ نے حضور اکرم ﷺ سے فتنوں کے بارے میں کچھ سوال کیے:

”یا رسول اللہ ﷺ ہم جاہلیت اور شر میں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لے آیا (یعنی اسلام) تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آجائے گا؟ فرمایا: ہاں (یعنی ارتداد و عرب) پھر میں نے عرض کیا: اس شر کے بعد خیر ہوگی؟ فرمایا: ہاں مگر اس میں کمزوری رہے گی۔ میں نے عرض کیا: کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا: ایسے لوگ ہوں گے جو میری راہ سے ہٹ کر عمل کریں گے، ان کی کوئی بات تمہیں پسند ہوگی اور کوئی ناپسند۔ میں نے عرض کیا: اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟ فرمایا: ہاں جہنم کے درازے پر بلانے والے کھڑے ہوں گے اور جو بھی ان کی طرف جھکے گا وہ اسے جہنم میں دھکیل دیں گے۔ میں نے عرض کیا: ان کی کچھ نشانیاں تو بتائیے۔ فرمایا: ہمیں میں سے ہوں گے اور ہماری زبان بولیں گے (یعنی کہیں گے اپنے آپ کو مسلمان، مگر عقائد و اعمال میں کتاب و سنت اور اجماع صحابہ کے خلاف ہوں گے) میں نے عرض کیا: اگر ایسا وقت آجائے تو میرے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔“

علماء اور خلفاء کے باہمی تعاون اور احترام ہی کی یہ برکت تھی کہ دین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیلا۔ فتوحات اسلامیہ کا دائرہ بڑھا اور اقوام عالم میں ثقافت اسلامیہ کی عظمت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ویسے ہمارے اسلاف کرام اور خلفائے عظام کے درمیان غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں اور بعض بعض کے مابین تو تلخی بھی پیدا ہوئی۔ کشت و خون بھی ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری تاریخ پر خط نسخ پھیر کر کوئی یہ کہہ دے کہ ”چند قدم راہ راست چل کر جو یہ امت ہئی تو ٹہتی ہی چلی گئی“ یا بقول ان مودودی صاحب کے ۴۰ھ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی گویا تمام صحابہ جو ۴۰ھ کے بعد زندہ رہے اور تمام ائمہ و علماء فقہاء امت سب جاہلیت کے پیرو چلے آتے ہیں نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس۔

وفات امام

امام اعظم کی وفات کے سلسلے میں ایک مکروہ بات کو بڑی شہرت دی گئی ہے۔ یعنی امیر المومنین المنصور نے امام اعظم کو قاضی بنانا چاہا وہ تیار نہیں ہوئے تو قید کر دیا گیا۔ تازیانے لگائے گئے اور بالآخر زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نظام خلافت باطل تھا اور آپ چاہتے تھے کہ خلافت علویوں میں آئے۔ یعنی آپ کے نزدیک دین اور ملت اور دعوت تو کوئی چیز نہ تھی ایک مخصوص خاندان کی حاکمیت پر عقائد و اعمال کی صحت کا مدار تھا۔ صفحات گزشتہ میں ان خرافات کی تنقیح کی جا چکی ہے۔ یہاں ہم صرف آپ کی وفات کے بارے میں صحیح واقعہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ قید و تازیانہ اور زہر دینے یا باہمی بے حرمتی کی تمام داستان از سر تا پا باطل ہے اور قریب العہد مصنفوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔

قریبی زمانہ طبری کا ہے (۳۱۰ھ) انھوں نے امام صاحب کے بارے میں تین روایتیں لکھی ہیں اور ان میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ امام صاحب کو قید کیا گیا، کوڑے برسائے گئے یا زہر دیا گیا۔ پہلی روایت تو وہ ہے جو تعمیر بغداد کے سلسلے میں ہم نقل کر چکے کہ امیر المومنین المنصور نے انھیں صاحب فضل و عدالت و تفقہ و امانت سمجھ کر بغداد طلب کیا اور آپ نے خدمت

مشوضہ انجام دی۔ دوسری روایت یوں ہے:

ان المنصور ارادبا حنیفہ النعمان بن ثابت علی القضا فامتنع عن ذلك فحلف المنصور ان يتولى له وحلف ابوحنیفہ الايفعل فولاہ القيام ببناء المدينة وضرب الذین وعده واخذ الرجال بالعمل قال وانما فعل المنصور ذلك ليخرج عن يمينه، قال و كان ابوحنیفہ المتولى لذلك حتى فرع من استتمام بناء حائط ممالي الخندق و كان استتمامه في ٥١٢٩.

[المنصور نے ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کو قاضی بنانا چاہا مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں ان کی خدمت انجام دینی ہوگی اور ابوحنیفہ نے قسم کھائی کہ وہ ایسا نہیں کریں گے اس لیے انھیں شہر کی تعمیر کے لیے اینٹیں بنوانے اور گننے اور لوگوں کو اس کام پر لگانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ المنصور نے یہ محض اپنی قسم پوری کرنے کے لیے کیا۔ پھر کہتا ہے کہ ابوحنیفہ اس کام کے متولی رہے یہاں تک کہ اس شہر کی وہ فسیل مکمل ہوگئی جو خندق سے ملحق تھی اور یہ تکمیل ۱۲۹ھ میں ہوئی۔]

تیسری روایت ہے:

ان المنصور عرض علی ابی حنیفہ القضاء والمظالم فامتنع فحلف ان لا یقطع عنه حتی يعمل. فاخبر بذلك ابوحنیفہ فدعا بقصبة فعذ اللبن علی رجل قدلبنه و كان ابوحنیفہ اول من عدالین بالقصب فاخرج ایا جعفر عن یمینہ واعتل و مات ببغداد.

[المنصور نے ابوحنیفہ کو قضاء اور مظالم کی دادرسی کی خدمت پیش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک وہ کوئی خدمت انجام نہ دیں۔ ابوحنیفہ کو جب اس کی خبر دی گئی تو انھوں

نے ایک چھڑی منگوائی اور جس شخص نے اینٹیں بنائی تھیں اور اس کی اینٹیں گنیں ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے چھڑی سے اینٹیں گنیں۔ اس طرح انہوں نے ابوحنیفہ کی قسم پوری کر دی پھر وہ بیمار پڑ گئے اور بغداد میں وفات پائی۔

صرف یہ تین روایتیں ہیں جو طبری نے اس سلسلے میں بیان کیں اس کا اشارہ بھی نہیں کہ ان دونوں بزرگواروں کے مابین کوئی تلخی تھی اور امام صاحب پر وہ تشدد کیا گیا جو بعد کے لوگوں نے بیان کیا ہے، راعی اور رعایا کے مابین اس قسم کی باتیں کبھی نہ کبھی ہوتی رہتی ہیں۔ آخری روایت میں امام صاحب کی وفات بیماری کے سبب بیان کی گئی ہے نہ کہ کوڑوں کی ضرب یا زہر خورانی کے ذریعے۔ یعنی ان کی وفات طبعی تھی۔

روایتیں اگرچہ تین ہیں لیکن صحیح روایت وہی ہے کہ جن حضرات کو ان کے علم و تقویٰ اور دیانت کے علاوہ فنِ تعمیر میں مہارت کی بنا پر طلب کیا گیا تھا ان میں امام صاحب بھی تھے۔ اس خدمت کو مندرجہ بالا روایت میں خشت شماری سے تعبیر کر دیا گیا۔ بر بنائے دیانت و تقویٰ نگرانی تعمیر کی اس خدمت کے علاوہ جو دوسری علمی خدمتیں تھیں جنہیں آپ نے بخوبی انجام دیا وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ حضرت حجاج بن ارطاة بھی فقیہ اور عالم تھے۔ بغداد کی جامع مسجد انہی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی لیکن ان کے یا کسی دوسرے بزرگ کے متعلق خطیب نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی صرف امام صاحب کو ان فضولیات کے لیے خاص کیا ہے۔ یہ محض اس تعصب کے سبب ہے جو انہیں امام صاحب سے تھا اور مقصد ان کی توہین ہے اور یہ دکھانا کہ امیر المومنین المنصور کے نزدیک ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے غور روایت بھی لکھ دی: (الہم المصیب، ص ۱۲۳-۱۲۴، طبع دیوبند)

”..... راوی بیان کرتا ہے کہ اس نے ابو مسہر کو یہ کہتے سنا کہ فلاں کے باپ پر ائمہ مساجد اس منبر سے لعنت کیا کرتے تھے اور اشارہ دمشق کے منبر کی طرف کیا۔

فرہیانی کہتے ہیں کہ فلاں کے باپ سے مراد ابوحنیفہ تھے۔“

یہ روایت نقل کر کے سلطان المعظم فرماتے ہیں:

لم یکن غرض الخطیب ان یدکر هذا عن ابی حنیفة انما جعل ابا حنیفة ذریعة و اراد یدکر الناس بما نقل مما کان علی منبر دمشق ولم اتبع رجال هذا السند بالکشف لعلم الناس بمن اراد بالحکایتہ وشهرة الخبر اغث عن ذکرہ۔ لانہ احدًا لا بلغی علی المنیر الا باذن الامام و ابو حنیفة کان فی دولة بنی العباس فی زمن المنصور فلو لعن علی منبر دمشق لکان لعن علی منابر العراق اذ هی دار الخلافه۔ ولم ینقل هذا الخطیب ولا غیرہ۔

[خطیب کی غرض یہاں یہ نہیں ہے کہ ابوحنیفہ کا ذکر کریں۔ انھوں نے تو ابوحنیفہ کو ذریعہ بنایا ہے کہ منبر دمشق پر جو کچھ ہوتا تھا اسے لوگ ذہن میں رکھیں میں نے اس سند کے راویوں کی تحقیق نہیں کی کہ اس حکایت میں جس شخص کا ذکر مقصود ہے اسے لوگوں کی معلومات کے لیے دریافت کروں کہ اس خبر کو مشہور کر کے کس کے ذکر کو ناپاک کیا گیا ہے، کیونکہ کوئی شخص خلیفہ وقت کی اجازت کے بغیر منبر پر ایسی لغو بات نہیں کر سکتا۔ ابوحنیفہ، المنصور کے عہد میں خلافت عباسیہ کے شہری تھے اگر ان پر دمشق کے منبر سے لعنت ہوتی تھی تو عراق کے منبروں پر بھی ہوتی ہوگی کیونکہ وہ دار الخلافہ تھا۔]

لیکن ایسی بات نہ خطیب نے کہی ہے اور نہ کسی دوسرے شخص نے۔

خطیب کو امیر المومنین المنصور سے تعصب نہ تھا لیکن امام صاحب سے تھا اور اپنے تعصب میں وہ اتنے بہہ گئے کہ لوگوں کی نگاہوں سے انھیں گرانے کے لیے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ بے حیثیت شخص تھے اور امام المسلمین کے ہاں ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے کہ ان جیسے صاحب علم کو اس قسم کی ذہنیت سے بلند ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں دیکھنا چاہیے طبری کو جنھیں اپنے مخصوص شیعہ عقائد کی بنا پر نہ امیر المومنین سے کوئی دلی تعلق تھا اور نہ امام صاحب سے۔ اور وہ خطیب سے بہت پہلے

گزرے ہیں انھوں نے اس قسم کی کوئی بات کیوں نہیں بیان کی۔ حالانکہ ایسی کوئی روایت انھیں پہنچی ہوتی تو اسے بخوشی نقل کرتے۔

طبری کے بعد قریب ترین عہد کا مورخ مسعودی ہے۔ اسے بھی اپنے مخصوص عقائد کے تحت ان دونوں بزرگواروں سے کوئی دلی تعلق نہیں ہو سکتا تھا، اس نے تو کبار صحابہ پر طعن کی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ لیکن امام صاحب کی وفات کے سلسلے میں صرف اتنا لکھا ہے:

وفی سنتہ خمسین ومائة مات ابو حنیفہ النعمان بن ثابت مولیٰ تیم
اللات بن بکر بن وائل فی ایام المنصور ببغداد وتوفی وهو ساجد
فی صلوٰئہ وهو ابن سبعین سنہ.

[۱۵۰ھ میں ابوحنیفہ نعمان بن ثابت جو تیم اللات بن بکر بن وائل کے موالی میں
تھے، انھوں نے بعد عہد امیر المومنین المنصور بغداد میں وفات پائی۔ نماز پڑھتے
وقت سجدے کی حالت میں ان کا انتقال ہوا اور وہ اس وقت ستر برس کے تھے۔]

تدفین

امام صاحب کو امیر المومنین المنصور نے سرکاری اعزاز کے ساتھ اپنے خاندانی
قبرستان میں دفن کروایا۔ ابن قتیبہ (م ۲۸۶ھ) جو طبری سے بھی پہلے گزرے ہیں انھوں نے
المعارف میں امام صاحب کا تذکرہ اس عنوان سے کیا ہے ”ابوحنیفۃ صاحب الراعی رضی اللہ
عنہ“ اور فرماتے ہیں:

ومات ببغداد فی رجب سنة خمسین ومائة وهو یوم میذ ابن سبعین
سنة ودفن فی مقابر الخیزران.

[آپ کی وفات بغداد میں ہوئی رجب ۱۵۰ھ میں۔ اس وقت آپ ستر برس کے
تھے اور مقابر خیزران میں دفن کیے گئے۔]

امیر المومنین نے جن حضرات سے خدمات ملیں اور جن حضرات کی ان کی دل

میں قدر تھی ان کی وفات پر اعزاز اُپنے خاندانی قبرستان میں جگہ دی۔ سیدہ خیزران امیر المومنین ہارون الرشید کی والدہ ماجدہ تھیں۔ بعد میں یہ قبرستان انھی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

و اول من دفن فیہا الباقونہ بنت المہدی ثم الخیزران و دفن فیہا
محمد بن اسحق صاحب المغازی، و الحسن بن زید، و نعمان بن
ثابت و قیل ہشام بن عروہ.

[سب سے پہلے وہاں امیر المومنین المہدی کی صاحبزادی یاقونہ دفن ہوئیں پھر
سیدہ خیزران۔ اور وہیں محمد بن اسحاق صاحب المغازی دفن ہوئے نیز حسن بن
زید اور نعمان بن ثابت اور کہتے ہیں ہشام بن عروہ بھی۔]

یہ حضرت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب، امیر المومنین کے ہاں نہایت
مقرب تھے اور ان کی طرف سے مدینے کے والی بھی رہے ہیں پھر آپ نے انھیں اپنا ندیم بنالیا
اور وفات پر اپنے قبرستان میں انھیں دفن کیا۔

ہشام بن عروہ بن الزبیر، سیدنا زبیرؓ کے پوتے تھے اور انھیں علم الانساب اور تاریخ
کا علم اپنے والد ماجد حضرت عروہؓ سے ملا جو حضرت ام المومنین عائشہؓ کے سگے بھانجے اور شاگرد
رشید تھے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ الحاکم نے (معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۹۲) میں لکھا ہے:

قال ابو عبد اللہ فاما مدینۃ السلام فانی لا اعلم صحابياً توفی بها. الا
ان جماعته من التابعین و اتباع التابعین نزلوا ہا و ماتوا یہا. منهم
ہشام بن عروہ بن الزبیر و محمد بن اسحاق بن یسار، و اسماعیل
بن سالم الاسدی و ابو حنیفۃ الفقیہ و شیبان بن عبد الرحمن النحوی
و ابراہیم بن سعد الزہری جماعته ہوا لاء فی مقبرۃ الخیزران.

[ابو عبد اللہ کہتے ہیں: مدینہ السلام بغداد کے متعلق مجھے علم نہیں کہ وہاں کسی صحابی کی

وفات ہوئی ہو مگر یہ ہے کہ تابعین اور اتباع تابعین میں سے ایک جماعت وہاں آئی اور وہ حضرات یہیں دفن ہوئے۔ ان میں ہشام بن عروہ بن الزبیرؓ ہیں اور محمد بن اسحاق بن یسار اسماعیل بن سالم الاسدی، ابوحنیفہ الملقبہ، شیبان بن عبد الرحمن النخوی اور ابراہیم بن سعد زہری ہیں۔ یہ سب حضرات مقبرہ خیزران میں دفن ہیں۔ [

اس تدفین کے عمل سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر المومنین المنصور کے ہاں امام اعظم کا کتنا احترام تھا مگر ہوا پرست لوگوں نے امت کے ان عظیم المرتبت اماموں کے بارے میں کیسی لغو اور فضول باتوں کو شہرت دی ہے۔

علمائے امت دین کی بنیاد پر خلفائے اسلام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط رکھتے تھے اور خلفاء کے ہاں بھی علمائے امت کا بغایت احترام تھا۔ اسی وجہ سے علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور ثقافت اسلامیہ کو فروغ ہوا۔ کتنے بزرگوں کے احوال ہیں جنہوں نے اگر خلفائے اسلام کے ہاں وفات پائی تو ان کی تدفین سرکاری اعزاز سے ہوئی اور امیر المومنین نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ابو عبد اللہ الحاکم لکھتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۹۴) کہ: ”عبد العزیز بن عبد اللہ بن ابی سلمۃ المہاشون جو اکابر علماء میں ہیں وہ بغداد تشریف لائے اور وہیں وفات پائی تو امیر المومنین المہدی عباسی ان کی دفن میں شریک ہوئے خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انہیں دفن کیا، اسی طرح عبد الملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم کو امیر المومنین الرشید نے قاضی بنایا۔ ان کی وفات پر خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انہیں دفن کیا اور ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرست لوگوں نے خلافت قائمہ اور علماء امت کے مابین اختلافات کے جو فرضی واقعات بیان کر کے نظام خلافت کو باطل قرار دینا چاہا ہے وہ اپنے بیان میں کاذب ہیں اور انفر اپرداز۔

حوالہ جات

۱۔ امیر المومنین المامون کا حافظہ بھی عجوبہ روزگار تھا۔ عبداللہ بن ادریس کی خدمت میں حاضر ہوئے جو امام اعظم کے اکابر تلامذہ میں ہیں۔ انہوں نے سوحدشیں بیان کیں بعد میں المامون نے عرض کیا عم محترم اجازت ہو تو یہ احادیث سناؤں۔ ابن ادریس نے فرمایا سناؤ تو انہوں نے من وعن سب سنادیں۔ ابن ادریس دنگ رہ گئے۔ یہ زمانہ مامون کی ولایت عہد اور طالب علمی کا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

۲۔ عہدہ قضا قبول کرنا آسان کام نہیں اسی لیے ہمارے بہت سے ائمہ قاضی بننے سے گریز کرتے تھے دو آدمیوں کے مابین فیصلہ کرنا اتنا سخت کام ہے کہ حسب روایت احمد و ابی داؤد و ترمذی و ابن ماجہ من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغير سكين (جس شخص کو لوگوں کے مابین قاضی بنایا گیا تو گویا اسے چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا) وقائع تاریخی میں ہمارے بعض ائمہ کا قاضی بننے سے انکار اسی خوف و خشیت کی بنا پر تھا نہ کہ اس لیے جو ہوا پرست لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کرنا نہیں چاہتے تھے اور جنہیں اپنے اوپر اعتقاد تھا انہوں نے یہ عہدہ قبول کیا ورنہ ہمارا عدلیہ اہل عالم کے لیے نمونہ کیسے بنتا۔



امام اعظم ابوحنیفہ اور شیعیت

امیر المؤمنین سیدنا عثمان ذوالنورین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ، روئے زمین کے عظیم ترین حکمران تھے۔ جن کے ایک اشارے پر ملک کے ملک فتح کر ڈالے جاتے تھے۔ جن کے احکام سے سرتابی کو خدا اور رسول کی نافرمانی سمجھا جاتا تھا اور جن کی شخصیت صحابہ کرام کی نگاہ میں محبوب ترین تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

احبک والرحمن

حب قریش عثمان

[بخدا میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسی محبت قریش کو عثمان سے ہے۔]

اس سرآمد محبوبان بارگاہِ احدیت و رسالت کو چند بے ننگ و نام لوگوں نے خاص دار الخلافہ میں شہید کر ڈالا اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ سانحہ امام برحق کے محض اس اصرار کے سبب ہوا کہ کسی کلمہ گو پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ ورنہ ایسا کرنے والے کو میں اپنی بیعت سے خارج کر دوں گا۔ اس منظر کا نقشہ حضرت کعب بن مالک انصاریؓ نے یوں کھینچا ہے:

فکف ید یدہ واغلق بابہ	وایقن ان اللہ لیس بغافل
وقال لاهل الدار لا تقتلوہم	عفا اللہ عن کل امری لم یقاتل
فلیف رأیت اللہ صب علیہم	السعداۃ والبغضاء بعد التواصل
وکیف رأیت الخیر ادبر بعدہ	عن الناس ادبار الريح الجوافل

انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور پھر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اور یقین رکھا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ گھر کی حفاظت کے لیے جمع تھے ان سے فرما دیا، انھیں قتل مت کرنا خدا ہر اس شخص کو بخش دے جو تلوار نہ اٹھائے۔ تو دیکھ لو اللہ نے ان لوگوں کو یک جہتی کے بعد ان کے مابین کس طرح عداوت و بغض کو مسلط کر دیا۔ اور دیکھ لو کہ ان کی شہادت کے بعد بھلائی نے لوگوں سے کیسے منہ موڑ لیا۔ جیسے تیز و تند ہوا اسے اڑا لے گئی ہو۔]

خواجہ حسن بصری اس وقت چھ برس کے تھے مگر یہ منظر جو بچپن میں خود بھی دیکھا اور بزرگوں سے سنا انھیں خوب یاد تھا۔ فرماتے ہیں: (تفسیر المنارج، ۸)

خرج علينا عثمان بن عفان رضى الله عنه يوم اخطبنا فقطعوا عليه كلامه فتراموا بالبطحاء حتى جعلت ما ابصر اديم السماء قال و سمعنا صوتا من احدى حجاز اذ اوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقيل هذا صوت ام المؤمنين قال سمعتها وهى تقول الا ان نبيكم قد برى ممن فرق دينه واحتزاب وقالت: ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعاً لست منهم فى شيء.

[امیر المؤمنین عثمانؓ ایک دن خطبے کے لیے تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کی بات کاٹ دی اور اتنی کنکریاں پھینکیں کہ فضا پر چھا گئیں اور مجھے آسمان نظر نہیں آتا تھا اتنے میں ازواج مطہرات کے ایک حجرے سے آواز بلند ہوئی اور کہا گیا کہ یہ ام المؤمنین عائشہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی آواز ہے۔ آپ فرما رہی تھیں یاد رکھو تمہارے نبی اس شخص سے بری ہیں جس نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گروہ بندی کی پھر یہ آیت پڑھی ”جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے (اے نبی) ان سے کسی بارے میں کوئی تعلق نہیں۔“]

یہ تھی اس مظہر جمال خلیل اللہ اور پرتو کمال ذبیح اللہ کی شہادت عظمیٰ جس کی نظیر از آدم

تا ایندم کہیں نہیں ملتی کہ پوری طاقت رکھنے اور اپنے فدائیوں کی جمعیت کے باوجود آدمی تلوار نہ اٹھانے دے اور جان لے جان آفریں کے سپرد کر دے۔ پھر انھی قاتلوں کے ہاتھ حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اور اس سبب سے اس وقت مسلمانوں کے دو سیاسی گروہ پیدا ہو گئے اور حالات ایسے بگڑے کہ کشت و خون تک نوبت پہنچی۔

جس گروہ نے حضرت علیؑ کی خلافت تسلیم کر لی تھی اور ان میں بعض صحابی بھی تھے، یہ لوگ شیعہ علی کہلائے۔ ان کا موقف تھا کہ اولین مسئلہ حضرت علیؑ کی بیعت کی تکمیل کا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مسائل ہیں۔

ان کے مقابلے میں وہ صحابہ اور دیگر حضرات تھے جن کے نزدیک اولین مسئلہ خون عثمانؓ کے قصاص کا تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کی خلافت تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا، کیونکہ وہ اس بیعت کے انعقاد کا طریقہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ یہ نئی خلافت شہید مظلوم کے قاتلوں نے برپا کی تھی۔ اور وہی اس کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ یہ حضرات شیعہ عثمان کہلائے ان میں بھی اجلہ صحابہ تھے۔ یعنی عشرہ مبشرہ میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور سب سے بڑھ کرام المؤمنین عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا۔ نیز حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہم۔

اسی اختلاف کے سبب جمل و صفین کے معر کے ہوئے۔ لیکن شیعہ علی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور حضرت علیؑ کی خلافت کی آئینی حیثیت آخر وقت تک معرض بحث رہی جب تک کہ آپ ہی کے ایک باغی نے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ اختلاف خالص سیاسی تھا اور اجتہاد پر مبنی۔ اسے پُر امن طریقے پر طے کیا جاسکتا تھا اور اس کے مواقع بھی بار بار پیدا ہوئے مگر امت کے اندرونی دشمنوں کے سبب ایسا نہ ہو سکا اور مفت میں خونریزی ہوئی، اس نزاع کے سیاسی اور اجتہادی ہونے کی سب سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اگر ایک طرف حضرت علیؑ ہیں تو دوسری طرف ان کے سگے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ۔ اگر حضرت علیؑ کی طرف مہاجر بن خالد بن ولید ہیں تو حضرت معاویہؓ کی طرف ان کے بھائی عبدالرحمان بن خالد بن ولید۔ اگر حضرت علیؑ کے ساتھ محمد بن ابی بکرؓ ہیں۔ تو حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ۔

اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ غیر جانبدار ہیں تو ان کے بھائی حضرت عبید اللہ بن عمرؓ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں۔ معلوم ہوا کہ شیعہ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ میں نہ کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی چپقلش، بلکہ یہ دوسیا گروہ تھے جو فلاح امت کے لیے اپنے اپنے موقف کو صحیح سمجھتے تھے اور انھیں اپنی حقانیت و عزائم کے تعمیری ہونے کا ایسا یقین تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی وہ باز نہ رہ سکے۔

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں لیکن جنگ میں حصہ نہیں لیتے اور اسے مفادِ ملت کے خلاف جانتے ہیں اسی طرح حضرت حسنؓ ہیں تو اپنے والد ماجد کے ساتھ مگر قتال سے انھیں بھی گریز ہے اور چاہتے ہیں کہ امت کا کلمہ متحد رہے اور خوں ریزی نہ ہو۔ ۲۔ حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار نہیں بشرطیکہ وہ قاتلانِ عثمانؓ سے بے تعلق ہو جائیں حضرت علیؓ کو قصاصِ عثمانؓ کے وجوب سے انکار نہیں، مگر چاہتے ہیں کہ اول ان کی بیعت کی تکمیل ہو۔

ساری پیچیدگی ان قاتلوں نے پیدا کر دی ہے جو حضرت علیؓ کی خلافت پر حاوی ہیں اور کوئی مسئلہ خوش اسلوبی سے طے نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں اپنی خیر نظر نہیں آتی، ان کا نصب العین ہے کہ امت میں فساد ہو۔ اور انتشار پھیلے، ان کے عزائم کے بارور ہونے کی سبیل ہی یہ تھی کہ امت کا کلمہ متفرق رہے اور اختلاف کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اس سیاسی خلفشار کو وہ مذہبی اور خاندانی رنگ دے کر فرقہ بازی کے درپے ہیں۔ تاکہ امت کا مستقبل تباہ ہو۔ حضرت علیؓ کی خواہش بھی تھی کہ اس چپقلش کو صرف سیاسی سمجھا جائے۔ اور فرقہ بازی پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہی مسئلہ صاف کرنے کے لیے آپ نے صفین کے بعد ثلاثی نامہ ہونے پر اپنے اور اہل شام کے بارے میں ایک گشتی مراسلہ جاری کیا اور اپنی وضاحت کر دی کہ ان جنگوں کو سیاسی کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ دیا جائے۔ یہ مراسلہ کتب تاریخ کے علاوہ نہج البلاغۃ کے مصنف نے بھی نقل کیا ہے۔ (نہج البلاغۃ، ج ۲، ص ۱۵۹)

”یہ گشتی مراسلہ ہے۔ جو (علی) علیہ السلام نے تمام شہروں میں بھیجا۔ اس میں آپ

نے وہ صورت حال بیان کی ہے۔ جو آپ کے اور اہل شام کے مابین پیدا ہو گئی تھی، اس میں فرماتے ہیں:.... ہمارے معاملے کی ابتدا یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک، ہمارا اور ان کا نبی ایک، ہماری اور ان کی دعوت اسلام ایک، اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے۔ پس معاملہ واحد ہے سوائے اس کے کہ ہم میں اور ان میں خون عثمانؓ کی بابت اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری ہیں....“

ان شیعہ علی اور شیعہ عثمان کے علاوہ امت کا سواد اعظم تھا اور صحابہ کرام کا جم غفیر، ان کا موقف تھا کہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل ہو جانی چاہیے۔ لیکن خون عثمانؓ کا قصاص بھی سب سے زیادہ مقدم ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان دونوں مسئلوں کو جنگ کے بغیر باہمی گفت و شنید سے طے کیا جائے۔ ان حضرات کی کوشش تھی کہ ان کی طرح تمام امت کو جنگوں میں فریق بننے سے گریز کرنا چاہیے۔ تاکہ پُر امن ماحول میں تصفیہ کر لیا جائے، اس سواد اعظم کے نزدیک یہی وہ فتنہ ہے جس سے حضور اکرم ﷺ نے ڈرایا ہے۔ عشرہ مبشرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، بن حارثہ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابو مسعودؓ، حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہم تھے۔ امت کے ان عظیم رہنماؤں نے جس طرح لوگوں کو ان جنگوں سے محترز رہنے کی تلقین کی، اس کی تفصیلات صحاح میں موجود ہیں، جنہیں نقل کرنا موجب طوالت ہوگا۔ مختصراً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تبصرے پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے۔ (منہاج السنہ، ج ۲، ص ۲۱۹-۲۲۰)

وكان ترك القتال خيراً للطائفتين مع ان علياً كان اولي بالحق هذا
قول احمد واكثر اهل الحديث واكثرائمة الفقهاء وهو قول اكابر
الصحابه والتابعين لهم باحسان وهو قول عمران بن حصين رضى
الله عنه وكان ينهى عن بيع السلاح فى ذلك القتال ويقول هو بيع
السلاح فى الفتنه وهو قول اسامة بن زيد ومحمد بن مسلمة وابن

عمر وسعد بن ابی وقاص واکثر من بقى من السابقين الاولين من المهاجرين و الانصار رضى الله عنهم ولهذا كان مذهب اهل السنة الا مساک عماشجریبن الصحابة فانه قد ثبت فضائلهم ووجبت موالاتهم ومحبتهم.

[دونوں فریقوں کے لیے بہتر تھا کہ نہ لڑیں اگرچہ حق حضرت علیؑ کے زیادہ قریب تھا۔ یہ قول ہے امام احمد کا۔ اکثر اہل حدیث کا اور فقہاء کے اکثر ائمہ کا اور یہی قول ہے اکابر صحابہ کا، اور خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں کا اور یہی قول ہے عمران بن حصینؓ کا وہ ان جنگوں میں ہتھیاروں کی خرید و فروخت سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہتھیاروں کا یہ کاروبار موجب فتنہ ہے، اور یہی قول ہے اسامہ بن زید کا، محمد بن مسلمہؓ کا ابن عمرؓ کا، سعد بن ابی وقاصؓ اور اکثر ان حضرات کا جو مہاجرین و انصار کے اولین طبقے کے اس وقت موجود تھے اسی لیے اہل السنۃ کا مذہب ہے کہ صحابہ کے اختلاف کے ذکر پر اپنی زبان روکیں، کیونکہ ان کے فضائل ثابت ہیں۔ اور ان سے تعلق خاطر رکھنا اور محبت رکھنا امت پر واجب ہے۔]

صفین کا معرکہ جنگ بندی اور ثالثی پر منتج ہوا اور یوں فریقین خوں ریزی سے کنارہ کش ہو گئے۔ ثالثوں نے فیصلہ وہی کیا جو غیر جانب دار اور جنگوں سے محترز رہنے والے حضرات چاہتے تھے۔ یعنی پُر امن ماحول میں صرف اصحاب رسول اللہ ﷺ کے شوریٰ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص اور حضرت علیؑ کی خلافت کی آئینی حیثیت کا تصفیہ کیا جائے ابھی آخری اجتماع نہیں ہوا تھا کہ حضرت علیؑ کو ایک خارجی نے شہید کر دیا اور حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔ (صحیح البخاری، کتاب الصلح) پھر تمام صحابہ اور جمہور امت نے حضرت معاویہؓ کی خلافت پر اجماع کر لیا۔ اہل حق کے باہمی نزاع کا جب ایک فریق نہ رہا تو یہ قدرتی بات تھی کہ زمام امت فریق ثانی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ سب امت جیسے پہلے ایک تھی پھر ایک ہو گئی اور پرانی باتیں سب بھلا کر اسی ارتقاء کی راہ پر رواں دواں ہو گئی جو شروع سے اس کا طریقہ کار تھا۔

لیکن ایک گروہ ابھی موجود تھا جسے وحدت امت گوارا نہ تھی اور جس نے یہ سب فتنے اٹھائے تھے۔ صحابہ کرام اور بنی ہاشم (آل بیت نبوی) کے طریقے اور عمل کے خلاف اس گروہ نے اپنا جتھہ ریز میں برقرار رکھا اور پھر عقائد و اعمال کے اعتبار سے ایک مستقل فرقہ بن گیا اور اپنا نام شیعہ علی باقی رکھا، اسی گروہ میں سے خوارج پیدا ہوئے تھے اور اسی گروہ کی پھر ذیلی شاخیں بنیں جو سب ایک دوسرے کی کذب ہیں اور اپنے علاوہ دوسرے کو گمراہ، غلط رو اور باطل پرست کہتے ہیں۔

جوشیعہ علیؑ اور شیعہ عثمانؓ ایک ہو گئے تھے اور اپنے یہ امتیازی نام چھوڑ دیئے تھے وہ اور جو گروہ عظیم غیر جانب دار تھا، انھوں نے باہم ربط مستحکم کر کے فرقوں کے مقابلوں میں اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہا اور یہی امت کا سواد اعظم ہے۔ اسی نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کے سال کا نام عام الجماعت رکھا کیونکہ صحیح العقیدہ تمام امت ایک مرکز کے تحت منظم ہو گئی تھی۔ یہی سواد اعظم ہے۔ جو شروع سے آج تک سواد اعظم ہی چلا آ رہا ہے، وحدت امت کا داعی ہے اور دعوت محمدیہ کا واحد علمبردار۔ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی امت کے اسی سواد اعظم کو حضور اکرم ﷺ کی دعوت کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی مذہب حضرت علیؑ اور آپ کی صحیح النسب اولاد کا ہمیشہ رہا۔ ان میں سے بعض نے اپنی حکومت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن عقائد و اعمال اسلامیہ پر سب متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ نبی ﷺ کی خلافت کا شرعی حق حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کا ہے اور نہ کسی نے اپنے آپ کو معصوم کہا اور حجۃ اللہ جانا ان کا جم غفیر جو عملی سیاست سے کنارہ کش رہا مثلاً حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) ان کے فرزند محمد (الباقر) اور ان کے فرزند جعفر (صادق) یا دوسرے حسنی اور حسینی حضرات سب کے سب اپنے وقت کے خلفاء کی بیعت پر مستقیم رہے۔ اس نظام خلافت کو صحیح اسلامی نظام سمجھا اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو سیاسی اختلال کا سبب بنے۔

ان میں زید یہ کے نام سے ایک فرقہ البتہ بنا، ان کے اخلاف نے اپنی حکومت قائم بھی کی، لیکن ان کے ہاں یہ امر عقائد میں ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت کی کوئی شرعی دلیل نہ تھی

اور خلفاء کرام کی خلافت حق تھی البتہ یہ انھوں نے ضرور کہا کہ نبی ﷺ سے رشتے کے سبب ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ خلافت پر فائز ہوں۔ اور یہ بات ایسی ہی ہے جیسے مختلف خاندانوں کے لوگ اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کیا کرتے ہیں۔ حصول حکومت کو شرعی حیثیت سے عقیدہ بنانا یا کسی خاص شخص کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خلیفہ مقرر ہونے کا تصور نہ زید یہ کا تھا اور نہ کسی دوسرے علوی یا ہاشمی کا۔

ہاشمیوں کی سیاسی اور عمرانی واحد تحریک دعوت عباسیہ تھی لیکن اس دعوت کی بنا پوری طرح سیاسی اور عمرانی رکھی گئی۔ اس دعوت میں جو دنیا کی کامیاب ترین عوامی تحریکوں میں سے ہے اس تصور کا سہارا نہ لیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمان الہی کے تحت آل عباسؓ کو خلافت کا مستحق قرار دیا تھا۔ اور اس دینی بنیاد پر وہ کھڑے ہوئے ہیں، خاندانی شرف اور افضلیت کا بے شک ذکر ہوا۔ مگر سبائیہ کے مقابلے میں جو حضرت علیؓ کو حضور اکرم ﷺ کا وارث اور جانشین کہتے تھے اور اسے فرمان الہی بتاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کہا گیا کہ چچا کی موجودگی میں چچا کا بیٹا کیسے وارث ہو سکتا ہے۔ لیکن عوام کے سامنے جو اصول بتایا گیا وہ یہ تھا کہ خلافت اسلامیہ میں عربوں اور غیر عربوں سب کی نمایندگی ہونی چاہیے۔ امیر المؤمنین ہارون الرشید نے جو اپنے وقت کے سردار بنی ہاشم اور نمائندہ اہل اسلام تھے انھوں نے شاہ روم کو جو نصرانی دین کا نمائندہ تھا ایک مبسوط تبلیغی مراسلہ بھیجا، اس میں منقولی اور معقولی دلائل کے علاوہ حضور اکرم ﷺ کی منافع دینیوں سے بے نیازی کے ثبوت میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان کے سیاسی تفوق کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ کرتے تو اس کی پذیرائی کی جاتی فرماتے ہیں: (عصر المامون، طبع ۱۹۲۷ء، دارالکتب مصریہ، طبع ثانی رسالہ ابی الریح محمد بن ثابت)

لعمر الله لو اراد الملك لا قاربہ و اراد طلب السلطان لذوى رحمة
لو كد لهم عقداً لا يحل ولا برم لهم امر الا ينقض ولائهم لهم فري
عنقوان امره ملكا لا يخرج من ايديهم ولا يبرح ابداً فيهم.

| بخدا اگر وہ (حضور ﷺ) اپنے رشتہ داروں کی حکومت چاہتے اور عزیزوں کی

حکومت کے خواہش مند ہوتے تو تاکید کے ساتھ عہد کو ایسا پختہ کر دیتے کہ اسے توڑنا نہ جاسکتا اور بات کو ایسی مضبوط کر دیتے کہ ٹالی نہ جاسکتی اور ابتداءً تحریک ہی میں ان کی حکومت کی جڑیں ایسی گہری کر جاتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نہ نکلتی اور ہمیشہ انھی میں رہتی۔]

کیا یہ بیان اس بارے میں شافی نہیں کہ نبوہاشم اپنی حکومت کو اللہ تعالیٰ کے شرعی فرمان کے تحت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس انسانی کوششوں پر مبنی رکھا اور اسی اعتبار سے کامیابی یا ناکامی ہوئی۔ جس کی کوشش تعمیری انداز میں رائے عامہ کو اپنے حق میں استوار کرنے پر مذکور رہے اسے کامرانی نصیب ہوئی اور جو صحیح بنیاد پر کھڑے نہ ہوئے نسبی تعلیموں ہی پر جن کے پروپیگنڈے کا دار و مدار رہا وہ ناکام رہے۔

چنانچہ محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم یا ایسے ہی دوسرے وہ علوی جو وقتاً فوقتاً خلفائے اسلام کے خلاف بغاوتیں اور خروج کرتے رہے، ان سب کی کوششیں انسانی اور سیاسی تھیں حکم الہی اور فرمان نبوی کا سہارا کسی نے نہیں لیا۔ اور نہ اپنے آپ کو معصوم کہا ان میں سے بعض نے جو مظالم ڈھائے اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کیا، یا امت سے علانیہ غداری کی تو اس پر معصومیت کا پردہ کسی نے نہ ڈالا۔

زیدید کے ایک بہت بڑے عالم محمد بن الحسن دیلمی نے اپنی کتاب قواعد عقائد آل محمد لکھی، اس میں اسماعلیہ اور ثناء عشریہ کے مذہب کا بطلان، انسانوں کے بارے میں ان کا مہلک غلو اور حضرات صحابہ کرامؓ کو راہ حق سے ہٹا ہوا سمجھنا بیان کر کے بتایا ہے کہ زیدید کے نزدیک یہ کفر محض ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کی ابتدا ان کلمات سے کرتے ہیں۔ (مطبعة السعادة مصر، ۱۹۵۰ء) یہ کتاب امام یحییٰ حمید الدین کے ہاں مخطوطے کی صورت میں تھی۔ اب اسے شائع کیا گیا ہے)

بسم الله الرحمن الرحيم. قبل الاشتغال ببيان مذهب الباطنية نذكر طرفاً من مذهب الغلاة والمفوضة لانهم منهم ايضاً. وذلك لان

اصول مذهب الغلاة والمفوضة و الباطنية من الاسماعيلية والا
مامية الاثنا عشرية مختلط بعضها ببعض فى كثير من المسائل
ولذلك قيل الامامية دهليزا الباطنية لان الكل دخلوا فى الشيعة
من جهتهم و كلهم يدعون التشيع ويغلون فى الدين ويخرجون من
طريق المسلمين.

[باطنیوں کا بیان کرنے سے پہلے ہم غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں بیان کرنا
چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ بھی انھی میں ہیں، وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوض،
اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی اصول بہت سے مسائل
میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی
مذہب کی دہلیز ہے۔ انھی کے ذریعے لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں اور سب
کے سب تشیع کے مدعی ہو کر دین میں غلو کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے طریقے
سے نکل جاتے ہیں۔]

پھر آگے چل کر ص ۱۰۵ پر لکھتے ہیں:

منها انهم يكفرون الامة المسلمة باجمها ويسمونهم الامة
المنكوسة اي عن رشدها ويسمون الأئمة والعلماء والفضلاء من
لدى النبى صلى الله عليه وسلم الى يومنا الطواغيت والاصنام...
فاول صنم من اصنام الطاغوتية ابوبكر ثم عمر ثم عثمان ومن كان
مثلهم فى كل وقت وزمان... وهل هذا الا كفر صراح وشرك
محض؟

[ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تمام امت مسلمہ کو کافروں کی جماعت کہتے ہیں اور ان کا نام
انہوں نے امت سرگلوں رکھا ہے یعنی راہ راست چھوڑ دینے والی امت۔ پھر یہ
لوگ نبی ﷺ کے عہد سے آج تک کے تمام ائمہ، علماء اور فضلاء امت کو شیاطین

اور احضام کہتے ہیں.... (ان کے نزدیک) شیطانی بتوں میں پہلے بت ابو بکر ہیں پھر عمر اور پھر عثمان انہی کی طرح کے دوسرے وہ سب حضرات جو کبھی اور کہیں پیدا ہوئے ہوں.... کیا یہ تصور صریح کفر اور شرک محض نہیں ہے؟
مفوضہ ۳ اور غالیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا:

ان الله تعالى فَوَّض امر العالم الى الائمة الى على والحسن و
الحسين عليهم السلام وباقرى الائمة من بعدهم وهم يخلقون و
يرزقون ويميتون و يحيون ويعثون ويعاقبون ويشيرون.

[اللہ تعالیٰ نے کار جہاں ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے یعنی حضرت علی حضرت حسن حضرت حسین علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے۔ یہی لوگ پیدا کرتے ہیں، روزی دیتے ہیں مارتے ہیں جلاتے ہیں مرنے کے بعد اٹھاتے ہیں عذاب دیتے ہیں اور جزا دیتے ہیں۔]

امامیہ اثنا عشریہ اگرچہ اتنا تو نہیں کہتے مگر ان کے ہاں یہ عقیدہ عام ہے کہ جب حضرت علیؑ کو پکارا جاتا ہے تو وہ مدد کے لیے آتے ہیں۔ اسی لیے ”یا علی“ کا نعرہ اور مصیبت کے وقت انھیں پکارنے کا طریقہ ان کے ہاں رائج ہے۔ ۵۔ اور ناد علیاً ان کے مشہور و مقبول وظیفہ ہے۔ ساتھ ہی صحابہ کرام، امہات المؤمنین اور خلفائے اسلام پر لعنت ان کے ہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے شعبان کی پندرہویں شب آل ابی سفیان اور آل مروان رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنے کے لیے ان کے ہاں خاص ہے اور اسے بڑا شہر و وظیفہ سمجھا جاتا ہے۔

صحیح النسب علویین کے بعض طبقوں میں شیعہ تصورات، خاندانی تعلقی، پیدائشی بزرگی اور اپنے بزرگوں کی جناب میں غلو کا رواج اس وقت پڑا جب مشرق میں مجوسی الاصل بوہیہ ردافض اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صحابہ کرام پر لعن و طعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماتم حسینؑ اور عید غدیر کا اہتمام سرکاری طور پر کیا گیا اور حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے غیر معتدل عقیدت کا اظہار کیا جانے لگا۔ تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر معتبر کتاب سے ثابت ہے کہ ان

تمام بدعات و سنیاات کی ابتدا امیر الامراء معز الدولة اور اس کے بویہی خاندان نے کی، اس سے پہلے مسلمانوں میں ایسا کوئی تصور اور کوئی رواج نہ تھا۔ چنانچہ علامہ خضریٰ نے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ میں الدولة العباسیہ کے تحت ص ۳۸۳ پر کتب تاریخ کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے:

لقد كان اهل بغداد قبل الدولة البويهية على مذهب اهل السنة والجماعته ويفضلون الشيخين ابي بكر وعمر و على سائرهم ولا يقدحون في معاوية ولا غير من سلف المسلمين. فلما جأت هذه الدولة وهي متشعبة غالية نما مذهب الشيعة ببغداد و وجدله من قوة الحكومة انصاراً فقد كتب على مساجد بغداد ۳۵۱ هـ ماصورته، ”لعن الله معاوية بن ابي سفيان ولعن من غضب فاطمة فداكاً ومن منع ان يدفن الحسن عند قبر جده عليه السلام ومن نفى ابازر الغفاري ومن اخرج العباس عن الشورم“ والخليفة كان محكوماً لا يقدر على المنع واما معز الدولة فيا مره كان ذلك فلما كان الليل حكه بعض الناس فاراد معز الدولة اعادته فاشار عليه وزيره ابو محمد المهلبى بان يكتب مكانه ما يجيئى ”لعن الله الظالمين لال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا يذكر احدافى اللعن الا معاوية“

بویہی حکومت کے قیام سے پہلے اہل بغداد سب اہل سنت والجماعۃ کے مذہب پر تھے، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو سب صحابہ سے افضل سمجھتے تھے اور حضرت معاویہؓ یا مسلمانوں کے دوسرے بزرگوں میں سے کسی پر طعن نہیں کرتے تھے لیکن جب یہ حکومت قائم ہوئی جو غالی شیعہ حکومت تھی تو بغداد میں شیعہ کو فروغ ہوا۔ اور حکومت کی پشت پناہی سے اسے قوت ملی۔ چنانچہ ۳۵۱ھ میں بغداد کی مسجدوں میں جو عبارت لکھی گئی اس کی صورت یہ تھی: ”خدا تعالیٰ معاویہ بن ابی سفیان کو اپنی

رحمت سے دور کرے، اور اس پر بھی لعنت کرے جس نے فاطمہ سے فداک چھین لیا اور جس نے حسن کو ان کے نانا علیہ السلام کے پاس دفن نہ ہونے دیا، اور اس پر جس نے ابوذر کو شہر بدر کیا اور اس پر جس نے عباس کو شوریٰ میں شامل نہیں کیا۔
 خلیفہ وقت محکوم تھے اور انھیں اس سے روکنے کی قدرت نہ تھی یہ سب کام معز الدولہ کے حکم سے ہوا تھا۔ جب رات ہو گئی بعض لوگوں نے یہ عبارت مٹا دی۔ معز الدولہ نے چاہا کہ دوبارہ لکھوائے لیکن اس کے وزیر ابو محمد اہلبیت نے مشورہ دیا کہ اس کے بجائے حسب ذیل عبارت لکھوادے۔ خدا ان ظالموں پر لعنت کرے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اولاد پر ظلم کیا اور اس پر لعنت میں نام کسی کا نہ لے۔ سوائے معاویہ کے۔]

یہ لعنت حضرت صدیق اکبرؓ پر تھی۔ جن پر یہ افترا کیا گیا ہے کہ انھوں نے سیدہ فاطمہ کو فداک سے محروم کر دیا۔ پھر یہ لعنت حضرت مروانؓ پر ہے جن پر یہ بہتان رکھا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت حسنؓ کو حضور اکرم ﷺ کے پاس دفن نہیں ہونے دیا۔ حضرت ابوذرؓ کو شہر بدر کرنے کا جھوٹ حضرت عثمانؓ پر بولا گیا ہے، اور حضرت عباسؓ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے کا الزام حضرت فاروق اعظمؓ پر ہے۔

بوہی امیر الامراء کی حکومت خبیثہ کا جب خاتمہ ہوا تو خلفائے عباسیہ نے مستقل طور پر یہ عبارت لکھوادی۔ مساجد بغداد کے منبروں پر۔

الا ان خیر الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر ثم
 عمر ثم عثمان ثم علی ثم معاویہ خال المسلمین رضی اللہ عنہم
 اجمعین۔

یہ جان لو کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد انسانوں میں سب سے بہتر ابو بکر ہیں پھر عمر
 پھر عثمان پھر علی پھر معاویہ مسلمانوں کے ماموں اللہ ان سب سے راضی ہو۔]

قاضی ابو بکر ابن عربی نے چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی مسجدوں میں یہ عبارت لکھی

ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہ رد عمل تھا بویہی زندقہ والجاد کا ورنہ مسجدوں میں ایسی عبارت لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اہل ایمان تو اپنے تمام بزرگوں کا یکساں احترام کرتے ہی چلے آ رہے ہیں اور صحابہ کرام کے ساتھ جو عقیدت مسلمانوں کو ہے وہ دنیا میں دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اسلاف کے ساتھ کب رکھتے ہیں۔

یہی حال ان عبیدی ملاحدہ کا تھا جنھوں نے ادعائے فاطمیت کے ساتھ مصر میں حکومت قائم کی۔ ان کے متعلق تمام علمائے تاریخ متفق ہیں کہ (تاریخ الخلفاء، ص ۵، طبع مصر)

اکثرهم زنادقة خارجون عن الاسلام ومنهم من اظهر سب الانبياء
ومنهم من اباح الخمر ومنهم من امر بالسجود له والخير منهم
رافضی خبیث لئیم یا مر بسب الصحابة رضی اللہ عنہم۔

قال القاضي ابوبکر الباقلائی کان المهدی عیید اللہ باطنیاً خبیثاً
حریصاً علی ازالة ملة الاسلام اعدم العلماء والفقهاء لیتکمن من
اغواء الخلق وجاء اولاده علی اسلوبه اباحوا الخمر والفروج و
اشاعوا الرفض وقال الذهبي کان القائم بن المهدی شراً من ابیه
زندیقاً معلوناً اظهر سب الانبياء۔ وقال وکان العییدیون علی ملة
الاسلام شراً من التتر۔

وقال ابو الحسن القابسی ان الذین قتلهم عیید اللہ و بنوه من
العلماء والعباد اربعة الاف رجل لیردوهم عن الترضی عن الصحابة
فاختاروا الموت۔

ان میں اکثر زندیق ہیں اور اسلام سے خارج، ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے انبیائے علیہم السلام پر سب و شتم کیا بعض وہ ہیں جنھوں نے نشہ حلال کر دیا، ان میں وہ بھی ہیں جس نے اپنے آپ کو مجتہد کروایا، اور ان میں جو سب سے اچھا تھا۔ وہ رافضی تھا۔ خبیث تھا، مردود تھا، اور صحابہ پر لعنت کا حکم دیتا تھا۔

قاضی ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں مہدی عبید اللہ باطنی تھا خبیث تھا اور ملت اسلام کو مٹانے پر حریص تھا، اس نے علماء و فقہاء کو شہید کیا تاکہ مخلوق کو گمراہ کرنے کی طاقت اسے حاصل ہو جائے اور اس کی اولاد اسی کے طریقے پر چلی انھوں نے شراب نوشی اور زنا کاری حلال کر دی اور رخص کو فروغ دیا۔

امام ذہبی فرماتے ہیں قائم بن مہدی اپنے باپ سے بھی برا تھا، زندقہ تھا، بلعون تھا، انبیائے کرام علیہم السلام کو گالیاں دیتا تھا اور فرماتے ہیں، ملت اسلامیہ کے لیے عبیدی لوگ تاتاریوں سے بھی زیادہ برے تھے۔

ابوالحسن القاسمی کہتے ہیں کہ عبید اللہ نے علماء اور صلحاء میں سے جن حضرات کو شہید کیا وہ چار ہزار تھے انھیں وہ صحابہ کے لیے دعا کرنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے موت کو ترجیح دی۔]

سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اس دولت خبیثہ کا خاتمہ ہوا۔ حسن بن صباح اسی دعوت کا داعی تھا، بے شمار علماء و فضلاء و فقہاء کا خون اس کی گردن پر ہے۔

بویہوں اور عبیدیوں میں اگرچہ سیاسی اور مذہبی چشمک تھی مگر جہاں تک دین اسلام کو تباہ اور ملت اسلامیہ پر مصائب توڑنے کا مسئلہ ہے تو یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی معاون تھیں یہ سب روایات و صفحات تاریخ پر ثبت ہے اور کسی تاویل کی اس بارے میں گنجائش نہیں۔

غرض یہ کہ چوتھی صدی سے پہلے آل علیؑ میں ان عقائد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو عجمی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ قدمائے آل علیؑ کا ان عجیبی تصورات سے بیزار اور بری ہونے کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ آپس میں اپنے تعلقات مستحکم رکھتے تھے اور خلافت قائمہ یعنی اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ بھی ان کے روابط شریعت کے مطابق قائم تھے۔ لیکن ان کی طرف منسوب ہونے والے عجیب فرقوں نے انھیں آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہر فرقے کی امامت کا سلسلہ الگ ہے اور سب کے سب اپنے اپنے ائمہ کو انہی صفات سے متصف سمجھتے ہیں جو شیعیت کے امتیازات ہیں، اور دوسرے سلسلے کو کاذب اور مدعی جانتے ہیں۔ اگر واقعی آل علیؑ کو شیعہ تصورات سے کچھ دلچسپی

ہوتی اور ان کے ہاں امامت عرفی کا کوئی سلسلہ ہوتا تو ہر سلسلہ امامت کے لوگ ایک دوسرے کے حریف ہوتے اور ان میں یگانگت نہ پائی جاتی۔ شخصی اور انسانی حیثیت سے دوستی دشمنی یا رقابت و یگانگت اور بات ہے مگر دینی اعتبار سے دو متضاد نظریوں میں ہم آہنگی کا کوئی امکان نہیں۔ مثلاً یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک سلسلے میں علی بن حسین (زین العابدین) امام معصوم ہیں اور ان کا تقرر خدا کی طرف سے ہوا ہے اور دوسرے فرقے کے نزدیک یہی حیثیت ان کے چچا محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) کی ہے۔ اسی طرح امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں خدا کی طرف سے امامت موسیٰ بن جعفر (الصادق) کو ملی۔ اور اسماعیلیہ کے نزدیک ان کے بڑے بھائی اسماعیل بن جعفر کو۔ پھر اسی طرح ان کے اور بھی سلاسل ہیں جن میں سے کچھ ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہیں۔ خدا کی طرف سے تقرر اگر ایک ہوا ہے تو یقیناً دوسرے کا نہیں ہوا۔ اسی لیے یہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ اگر اسی تکفیر کا سلسلہ آل علی کے مابین بھی ہوتا تو نہ ان میں نہ باہمی تعظیم و تکریم و مودت ہوتی اور نہ رشتے داری یعنی سارا علم الانساب انہی کے ہاتھوں غارت ہو چکا ہوتا۔

امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں بارہویں امام محمد بن حسن ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بارہ سو برس سے غار میں چھپے بیٹھے ہیں اور ان پر سلسلہ امامت ختم ہو گیا لیکن اسماعیلیہ کے ہاں امامت جاری ہے اور موجودہ کریم آغا خاں ان کے ایک فرقے کے نزدیک امام عصر ہیں اور ان تمام صفات سے موصوف جو اہل تشیع کے سب فرقوں کے نزدیک امام میں ہوتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ یا امت مسلمہ کے دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کو اس قسم کے تصورات سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا اور امامت کا یہ تصور ان کے نزدیک کسی درجے میں کب درست سمجھا جاسکتا تھا۔ جب کے سب کے ہاں کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع صحابہ کرامؓ پر مدار کار ہے۔ امام اعظمؒ تو شیعی تصورات رکھنے والوں سے اتنے بیزار تھے کہ ان کی روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے الکفایہ فی علم الروایۃ میں اپنی سنت سے عبداللہ بن المبارک کے حوالے سے بیان کیا ہے: (ص ۱۲۶، مکتبہ السلفیہ، شیش محل لاہور)

سأل ابو عصمة اباحنیفة عن تأمرنی ان اسمع الاثار قال من کل

عدل فی ہواہ الا الشیعة۔ قال واصل مذہبہم تضلیل اصحاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

[ابوعصمتہ نے ابوحنیفہ سے دریافت کیا آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا حکم فرماتے ہیں۔ فرمایا: ہر معتبر ثقہ شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں جماعت سے ہٹا ہوا ہو۔ سوائے شیعہ کے، پھر فرمایا: ان کا (شیعہ کا) اصل عقیدہ یہ ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گم راہ ثابت کریں۔]

پھر یہی خطیب ص ۱۲۵-۱۲۶ پر فرماتے ہیں:

قد اسلفنا الحکایة عن ابی عبد اللہ الشافعی فی جواز قبول شهادة اهل الاهواء غیر صنف من الرافضة خاصة ويحکی ذلک عن ابی حنیفہ امام اصحاب الراى و ابی یوسف القاضی۔

[ہم نے پہلے ابو عبد اللہ الشافعی (الامام) کی یہ بات بیان کی ہے کہ ہوا پرست لوگوں کی روایت قبول کی جاسکتی ہے سوائے رافضیوں کے خاص طبقے کی یہی بات امام اصحاب الراى ابوحنیفہ سے نقل کی گئی ہے اور قاضی ابو یوسف سے۔]

امام اعظم کی پہلی ملاقات جب حضرت عطاء بن ابی رباح سے ہوئی اور طلب علم کے لیے آپ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا، تو اس کا حال ابن بطلان نے شرح بخاری میں اس طرح لکھا ہے: (تفسیر المنارج، ۸، ص ۲۱۵، طبع مصر)

عن ابی حنیفہ انه قال لقيت عطاء بن ابی رباح بمكة فسألتہ عن شئ فقال من اين انت؟ قلت ”من اهل الكوفة“ قال ”انت من اهل القرية الذی فرقوا دینہم و كانوا شیعاء؟“ فقلت ”نعم“ قال ”من الی الا صناف انت؟“ قلت ”ممن لا یسب السلف ویؤ من بالقدر ولا یکفر اخذاً بذنب“۔ فقال عطاء عرفت فالزم۔“

[ابوحنیفہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے مکہ میں عطاء بن ابی رباح سے

ملاقات کی اور ان سے کچھ سوال کیے انھوں نے پوچھا ”تم کہاں کے ہو“ میں نے عرض کیا ”کوفہ کا“ فرمایا ”تم اس بستی کے ہو جہاں کے لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے؟“ میں نے کہا ”جی ہاں“ فرمایا ”ان میں سے کس گروہ سے تمہارا تعلق ہے؟“ میں نے عرض کیا ”ان سے جو بزرگان سلف کی جناب میں بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں کہتے“ فرمایا ”تمہیں دین کا عرفان ہے، اسی پر جے رہو۔“

یہاں سے معلوم ہوا کہ اپنے مشائخ کرام کے طریقے پر امام صاحب کا شروع سے یہ مذہب تھا کہ سب صحابہ کرام کی تعظیم کریں، ان کے اختلافات میں فریق نہ بنیں، تقدیر پر ایمان رکھیں اور معاصی پر کسی کی تکفیر نہ کریں۔ یعنی نہ رافضی ہوں اور نہ منکرین قدر ہوں اور نہ خوارج۔ بلکہ پوری طرح جماعت سے وابستہ رہیں اور سنت کا اتباع کریں۔ یہی امت کے سواد اعظم کا مسلک ہے اور اسی سواد اعظم کے عظیم ترین ائمہ میں امام ابوحنیفہ ہیں۔ ان کی اس سے بڑی کوئی ہتک نہیں ہو سکتی کہ انھیں کسی فرقے سے منسوب کیا جائے یا خلفائے اسلام سے بے تعلق بتایا جائے۔ یا جمل و صفین جیسے سیاسی جھگڑوں میں کسی کو اچھا یا برا کہنے والا سمجھا جائے یا ان کی ہمدردیاں ایسے لوگوں کے ساتھ بتائی جائیں جنھوں نے امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہا۔ اور اپنے عہد کے متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت کی۔ امام اعظم کے سامنے ان کے شیخ اکبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل تھا۔ جو جمل و صفین کے معاملات میں غیر جانب دار رہے اور افتراق امت کو پسند نہ کیا۔ اسی لیے انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی، کیونکہ جماعت المسلمین اور امت کے سواد اعظم نے ان کی خلافت پر اجماع نہیں کیا تھا۔ اور اسی طرح انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی لیکن امیر المومنین معاویہؓ اور امیر المومنین یزیدؓ، امیر المومنین عبدالملک اور امیر المومنین الولید سے بیعت کی۔ اپنے تابعی شاگرد امیر المومنین عبدالملک سے آپ نے بیعت جن الفاظ میں تحریر کے ذریعے کی وہ موطا امام مالک اور صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۴، ص ۲۴۵، باب کیف یبالغ الامام الناس)

الی عبد اللہ عبد الملک امیر المومنین انی اقر بالسمع الطاعة لعبد
الله عبد الملک امیر المومنین علی سنة الله وسنة رسوله فیما
استطعت وان بنی قد اقر بذلک.

[بجانب بندہ خدا عبد الملک امیر المومنین میں اللہ کی مقرر کردہ سنت اور اس کے
رسول کی سنت پر اللہ کے بندے عبد الملک اور امیر المومنین کا فرمان سننے اور اسے حتی
المقدور بجالانے کا اقرار کرتا ہوں ایسا ہی اقرار میرے فرزندوں نے بھی کیا ہے۔]

پھر امام ابوحنیفہ کے سامنے اپنے دوسرے شیخ اعظم حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بھی یہ
عمل تھا کہ وہ اگرچہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ہر طرح ان کی مدد کی مگر انھوں نے بیعت سے لے
کر صفین کے معرکے تک بار بار انھیں روکنے کی کوشش کی اور ان اقدامات کے خطرات سے آگاہ
کیا۔ اور اس ٹولی سے محترز رہنے کی تلقین کی جس نے امت میں سارا فساد کھڑا کیا تھا لیکن بوجہ
چھوٹے بھائی ہونے کے ساتھ چھوڑنے کی جرأت نہ کی۔ ورنہ حقیقی جذبات ان کے ہاں وہی تھے
جوان کے سب سے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ کے تھے۔ اسی لیے انھوں نے حضرت علیؓ کی
شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ کو خط بھیج دیا تھا کہ ہم اب اختلاف ختم کر کے آپ سے صلح اور
بیعت کے لیے تیار ہیں۔ عجب نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو جو صلح اور بیعت کی دعوت
دی (صحیح بخاری، کتاب الصلح) وہ حضرت عباسؓ کے اسی مراسلے کے سبب ہو۔ حضرت حسنؓ
اور حضرت معاویہؓ کے مابین حضرت ابن عباسؓ نے صلح نامہ مرتب کر کے بحیثیت گواہ اپنے دستخط
کیے تھے۔ پھر انھوں نے امیر المومنین یزید کی ولایت عہد اور خلافت کی بیعت کی اور اس پر
مستقیم رہے۔ حرہ کے ہنگامے سے بنو ہاشم کو الگ رکھا۔ ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور آپ ہی
کے فرمان پر بنو ہاشم سب کے سب امیر المومنین عبد الملک کی بیعت میں داخل ہو گئے۔ حضرت
ابن عباسؓ کو اموی خلافت کے قیام کا انتظار تھا۔ اور وہ اس لگائے بیٹھے تھے کہ امیر المومنین
عبد الملک کامیاب ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے (ج ۳، کتاب التفسیر ،
ص ۱۳۶، باب قولہ ثانی اثنتین اذ ہما فی الغار) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

والله ان وصلونی وصلونی من قریب وان ربونی ربنی اکفاء کرام۔
فائز التویات والاسامات والحمیدات یرید ابطنامن بنی اسدبنی
تویت وبنی اسامه وبنی اسدان ابن ابی العاص برزیمشی القدمیة
یعنی عبدالملک بن مروان وانه لوی ذنبه یعنی ابن الزبیر۔

[بخدا اگر (بنو امیہ) میرے ساتھ صلہ رحمی کریں تو یہ صلہ رحمی قریب ترین عزیزوں
کی طرف سے ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں گے تو یہ پرورش ذی احترام ہم
چشموں کی طرف سے ہوگی تو پھر میں تویات، اسامات اور حمیدت کو کیوں ترجیح
دوں (آپ کی مراد بنو تویت، بنو اسامہ اور بنو اسد سے تھی) اور جو ابوالعاص کے
فرزند ہیں یہ مردانہ وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبدالملک بن مروانؓ اور جو صاحب ہیں
انھوں نے اپنی دم سیکڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیرؓ۔]

لیکن یہ فتح آپ کی زندگی میں انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اس لیے آپ نے اپنے
فرزندوں کو اپنی وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ سب شام چلے جائیں۔ اور ابن الزبیرؓ کی
حکومت میں نہ رہیں۔ چنانچہ یہ حضرات چلے گئے۔ امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: (فتح
الباری، ج ۸، ص ۲۶۲) فلحق علی بعبد الملک فکان اثر الناس عنده۔ [حضرت علی
بن عبداللہ بن عباسؓ امیر المومنین عبدالملک کے پاس چلے گئے اور وہ آپ کے ہاں نہایت درجہ
مقرب تھے] اسی طرح حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) نے امیر المومنین یزید
سے دونوں بیعتیں کی تھیں۔ اہل مدینہ کی بغاوت میں شریک نہیں ہوئے۔ ابن الزبیرؓ سے بیعت
نہیں کی اور التوابون اور مختار ثقفی نے خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے بہانے جو تحریکیں چلائیں ان
سے قطعاً بے تعلق رہے اور امیر المومنین عبدالملکؓ سے بیعت کی۔ آپ کے بیعت نامے سے ان
تمام خرافات کی تکذیب ہو جاتی ہے جنھیں اس سلسلے میں تاریخ کو مخخ کرنے والوں نے اچھالا
ہے۔ آپ کا بیعت نامہ یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم لعبد الله عبدالملک امیر المومنین من

محمد بن علی اما بعد فانی لما رایت الامۃ قد اختلفت اعتزلتہم و فلما افضی هذا الامر الیک وبایعک الناس و رابت الناس قد اجتمعوا علیک کنت لرجل منهم ادخل فی صالح ما دخلوا فیہ فقد بايعتک و بايعت الحجاج لک و بعثت الیک ببيعتی و نحن نحب ان تؤمننا و تعطينا ميثاقا علی الوفاء.

[بسم اللہ الرحمن الرحیم، بندۂ خدا عبد الملک امیر المومنین کی خدمت میں منجانب محمد بن علی۔ اما بعد میں نے جب یہ دیکھا کہ امت میں اختلاف پڑ گیا ہے تو ان سب سے الگ ہو کر بیٹھ گیا، پھر جب معاملہ آپ کے ہاتھ میں آیا لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی اور میں نے دیکھا کہ سب نے آپ پر اجماع کر لیا تو میں نے بھی اپنے آپ کو انھی میں کا ایک فرد سمجھا اور جس نیک کام میں وہ شریک ہو گئے میں بھی شریک ہوتا ہوں میں نے آپ سے بیعت کر لی ہے یعنی آپ کی بیعت حجاج کے ہاتھ پر کر لی اور اپنا یہ بیعت نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم کو محبوب ہے کہ آپ ہمیں امان دیں اور عہد پورا کرنے کا ہم سے وعدہ کریں۔]

امیر المومنین عبد الملک نے اس بیعت نامے کے جواب میں لکھا:

انک عندنا محمود. انت اجت و اقرب الینا رحمۃ من ابن الزبیر
فلک العهد و الميثاق و ذمة الله و رسوله ان لا تهج و لا احد من
اصحابک بشئ تکرهه. ارجع الی بلدک و اذهب حیث شئت
ولست ادع صلتک و عونک ما حییت. و کتب الی الحجاج یا امره
بحسن جواره و اکرامه فرجع ابن الحنفیۃ الی المدینۃ و
بہاداراً و اقام بہا.

[آپ ہمارے نزدیک قابل ستائش ہیں ابن الزبیرؓ کے مقابلے میں نسبتاً ہم سے قریب تر ہیں اور ہمیں محبوب ہیں اللہ کے ساتھ ہمارا عہد و پیمان ہے اللہ کا ذمہ ہے

اور اس کے رسول کا ذمہ ہے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایسی کوئی بات نہیں پہنچائی جائے گی جو آپ کو ناگوار ہو۔ آپ اپنے شہر کو واپس ہو جائیے اور جب جی چاہے جائیے۔ میں زندگی بھر آپ کی مدارات اور آپ کی امداد سے دریغ نہیں کروں گا۔ پھر (امیر) حجاج کو آپ نے ان کے ساتھ خوش معاہدگی اور احترام کا حکم نامہ بھیجا۔ چنانچہ جناب محمد بن علی (ابن الحنفیہ) مدینہ واپس ہوئے اور وہاں ایک گھر بنا کر مقیم ہو گئے۔]

امام ابوحنیفہ کو صحابہ کرام اور بنی ہاشم (آل بیت) کا طرز عمل معلوم تھا کہ اموی خلافت کے خلاف خروج کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور ان ہنگاموں سے انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی جو ابن الزبیرؓ کی حکومت قائم کرنے یا خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے نام سے جاری کی گئیں بلکہ ان تحریکوں سے انھوں نے بیزاری ظاہر کی۔ جمہور صحابہ اور آل بیت اور اپنے دونوں عظیم شیعہوں کے اس عمل کی موجودگی میں ان کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ کیسے ہو سکتی تھیں۔ جنھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف خروج کیا۔ وہ حضرت ابن عمرؓ کے اس ارشاد کو کیسے فراموش کر سکتے تھے جو صحیح بخاری میں مذکور ہے: (ج ۲، کتاب الفتن)

وانسى لا اعلم غدرًا اعظم من ان نبايع رجلا على بيع الله ورسوله ثم ن نصب له القتال.

[مجھے اس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں آتا کہ ہم اول تو ایک شخص کے ہاتھ پر خدا اور رسول کی بیعت کریں اور پھر اس سے لڑنے کے لیے پراجمائیں۔]

امیر المومنین یزید کے خلاف ابن الزبیرؓ کی حمایت میں اہل مدینہ نے جو بغاوت کی اور جرہ کا افسوس ناک اور تباہ کن حادثہ پیش آیا اس کے متعلق البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (ج ۸، ص ۲۰۸)

واعتزل الناس على ابن الحسين وكذلك عبد الله بن عمر بن الخطاب لم يخلعوا يزيد ولا من بيت ابن عمرو كذلك لم يخلع

یزیداً احد من بنی عبدالمطلب.

[حضرت علی ابن الحسین (زین العابدین) ان لوگوں سے (یعنی باغیوں سے) الگ رہے اور اسی طرح (حضرت) عبداللہ ابن عمرؓ بن الخطاب بھی، ان دونوں نے (امیر المومنین) یزید کی بیعت نہیں توڑی، اور نہ (حضرت) ابن عمرؓ کے گھرانے والوں نے، اسی طرح آل عبدالمطلب (یعنی بنو ہاشم) میں سے بھی کسی نے بیعت نہیں توڑی۔]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: (ص ۲۳۳)

وقد كان عبد الله بن عمر بن الخطاب وجماعة اهل بيت النبوة ممن لم ينقص العهد ولا بايع احدا بعد بيعة يزيد.

[حضرت) عبداللہ بن عمرؓ بن الخطاب اور اہل بیت نبوت (یعنی بنی ہاشم) کے سب لوگ ان میں ہیں جنہوں نے عہد نہیں توڑا اور (امیر المومنین) یزید سے بیعت کرنے کے بعد (ان کی زندگی میں) کسی سے بیعت نہیں کی (اور ان کے بعد حضرت ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی۔]

امام ابوحنیفہ کے یہ دونوں شیخ جو اجلہ صحابہ میں ہیں ان کا عمل ان کے سامنے تھا اور انہی کے نظریات کے تحت ان کی پرورش ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں شیعیت کی کوئی رُمق آسکے۔ علاوہ ازیں تابعین عظام میں جو ان کے اساتذہ ہیں یعنی قاضی شریح (م ۸۸ھ) علقمہ (م ۶۲ھ) مسروق بن الاعدع (م ۶۲ھ) اور اسود بن زید (م ۹۵ھ) جو خاص حادثہ کربلا کے وقت کوفہ میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے جمہور صحابہ کرام کے موقف کے مطابق حضرت حسینؑ کے اقدام کی حمایت نہیں کی جب تک کہ خود حضرت حسینؑ نے کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی جب وہاں کے حالات معلوم کر لیے کہ عراق پوری طرح امیر المومنین یزید کی بیعت پر مجتمع ہے اور سبائیوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب جھوٹ تھا تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کر دیا اور امیر المومنین یزید سے بیعت کرنے کے لیے کوفہ کی راہ سے پلٹ کر

کربلا دمشق کی طرف چل پڑے۔ لیکن آپ کے ساتھ جو ساٹھ سبائی تھے اور جو مکہ مکرمہ سے آپ کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لائے تھے ان کے سبب حادثہ کربلا رونما ہوا۔ اس حادثے کی ذمہ داری ہم عصرا مت نے حکومت پر نہیں ڈالی یعنی نہ عمر بن سعد پر نہ امیر عبید اللہ پر جانیکہ وہ امیر المومنین یزید کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے۔ حتیٰ کہ ابن الزبیرؓ نے امیر المومنین کے خلاف جب بغاوت کروائی تو انھوں نے بھی ان کے معائب و مظالم میں خون حسینؑ کا نام نہیں لیا۔ اور لیتے بھی کیسے جب انھیں صحیح صورت معلوم ہوتی تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس بغاوت میں کوئی ہاشمی شریک نہیں ہو رہا۔ کیونکہ حضرت حسین کے آخری موقف کی پذیرائی میں وہ حضرات جو حادثہ کربلا کے بعد زندہ بچے تھے انھوں نے دمشق جا کر امیر المومنین یزید سے بیعت کر کے حضرت حسینؑ کا منشا پورا کر دیا۔ اسی لیے وہ سب حضرات اپنی بیعت پر مستقیم رہے اور ابن الزبیرؓ کی خاطر بیعت توڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔

اسی طرح امام اعظم کے اساتذہ کرام جو عہد مرتضوی میں موجود تھے انھوں نے صفین کی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور غیر جانب دار رہے اسی طرح جو اساتذہ ان کے حادثہ کربلا کے وقت کوفہ میں موجود تھے انھوں نے حضرت حسینؑ کا ساتھ نہ دیا۔ اور ان کے خروج کو جائز نہ جانا۔ وہ مسلمانوں کے ان دو بڑے گروہوں کے اختلاف میں فریق بننے کے لیے تیار نہ تھے۔ حضرت علقمہؓ البتہ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور ایک ٹانگ سے معذور ہو گئے مگر پھر سیاست میں عملاً کبھی حصہ نہیں لیا اور علمی مشاغل ہی سے سروکار رکھا۔ اسی لیے امیر المومنین یزید کی بیعت توڑ کر حضرت حسینؑ کا ساتھ دینے سے بھی انھوں نے گریز کیا۔

ان حقائق تاریخیہ کی موجودگی میں وہ سب تصورات پادر ہوا ثابت ہوتے ہیں جو روایات واہبیہ کے ذریعے امام ابوحنیفہؒ کو کسی درجے کی شیعیت سے متہم کرنے کے لیے وضع کیے گئے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں اپنے مذہب کی تدوین میں خود امام صاحب کا عمل۔ امیر المومنین ابو جعفر المنصور کا فرمان اور اس کا امام صاحب کی طرف سے جواب اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ آپ کے ہاں استخراج مسائل کا کیا طریقہ تھا اور یہ کہ قیاس کو حدیث پر آپ کے ہاں مقدم

نہیں رکھا جاتا۔ یہی بات خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام صاحب کے طریقہ اجتہاد کی خود ان کی زبانی اس طرح بیان کی ہے:

”اول میں مسئلہ کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ ﷺ دیکھتا ہوں۔ اگر دونوں میں نہ ملے تو پھر آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اقوال دیکھتا ہوں ان میں سے جس کا قول چاہتا ہوں۔ چھوڑ دیتا ہوں لیکن ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ پھر بات اگر ابراہیم و شععی پر آپڑے یا ابن سیریں، حسن بصری، عطاء، سعید بن المسیب پر اور ایسے ہی آپ نے دوسرے نام لیے تو پھر میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں جیسے ان حضرات نے کیا۔“

اب سوچنا چاہیے کہ جو شخص اصحاب رسول اللہ ﷺ کے اقوال سے باہر جانے کو تیار نہ ہو اور ان کے اجماع کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے بعد حجت شرعیہ جانے وہ ان کے کسی اجماعی فیصلے کو باطل کیسے کہہ سکتا ہے۔ اموی خلافت صحابہ کرام کے اجماع سے قائم ہوئی تھی اور اس خلافت کے کارکنوں میں ہمیں صحابہ کرام کے اسمائے گرامی امیر المومنین ولید اول تک ملتے ہیں اور عباسی خلافت تو قائم ہی ہوئی تھی تمام امت کے اجماع سے۔ ایسی صورت میں نہ آپ اس خلافت کی حجیت پر شبہ کر سکتے تھے۔ نہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور کی اطاعت سے منہ موڑ سکتے تھے اور نہ ان خلافتوں کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص کا نظری یا عملی حیثیت سے ساتھ دے سکتے تھے۔

ان مؤلفوں اور مصنفوں کو سبائی روایات اپنی کتابوں میں درج کرتے وقت غور کرنا چاہیے تھا کہ جس امام کا مذہب کتابی صورت میں خود اس کے اپنے شاگردوں کے ہاتھوں میں مدون ہے اور تین چوتھائی امت جس مذہب کی پابند ہے۔ اس امام کے بارے میں ایسی روایات کیسے قبول کی جاسکتی ہیں جو خود اس کے مذہب اس کے اساتذہ کے مذہب اور اس کے تلامذہ کے مذہب کے خلاف ہیں۔ یہ روایات اگر کسی درجے میں صحیح ہوتیں تو کیا مذہب حنفی کو خلفائے اسلام کے ہاں سرکاری حیثیت حاصل ہو سکتی تھی؟ اور یہ امر مسلم ہے کہ خلافت عباسیہ

کا نظام قانون فقہ حنفی پر قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے عبیدی ملاحدہ کی حکومت میں اہل السنۃ کے معاملات کے لیے شافعی اور مالکی قاضیوں کو تو مقرر کیا گیا۔ کسی حنفی المذہب کو وہاں قاضی بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ عبیدیوں کے نزدیک وہ خلافت عباسیہ کا مذہب تھا۔

اخذ روایت میں سختی

علمائے حدیث میں بعض حضرات کے ہاں اہل ہوا و بدعت سے اخذ روایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی۔ امام اعظم ان میں ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور خصوصیت کے ساتھ یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیع پایا جاتا ہو۔ کیونکہ تشیع سے آدمی جمل و صفین میں فریق بن جاتا ہے۔ اور حادثہ کربلا کو غیر معمولی اہمیت دے کر جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جناب میں سوائے ظن کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی صحابی نے بھی حضرت حسینؑ کے خروج کی حمایت نہیں کی اور سب صحابہ نے جو ان سے ملے انھیں اس اقدام سے روکا۔ جب تک کہ انھوں نے کوفہ پہنچ کر اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المومنین یزید سے بیعت پر آمادگی کا اعلان کرتے ہوئے کوفہ کے راستے سے پلٹ کر براہ کربلا دمشق جانے لگے تھے کہ ان کے ساتھ ۶۰ کوفیوں کی غداری سے یہ سانحہ پیش آ گیا۔

گویا تشیع اپنے لوازمات کے ساتھ حضرت حسینؑ اور آپ کے فرزند ارجمند نیز دوسرے اعزہ و اقرباء کے مواقف کے خلاف ایک تحریک ہے۔ اسے اوّل التوابون نے تین برس کی خاموشی کے بعد اختلال کے زمانے میں جاری کرنا چاہا اور پھر مختار ثقفی نے، اور نام لیا۔ خونِ حسینؑ کے انتقام کا۔ لیکن نہ بنو ہاشم نے ان تحریکوں سے کوئی دلچسپی لی اور نہ صحابہ کرامؓ نے بلکہ سب ہم عصر امت نے ان کے قائدین کو گمراہ جانا اور کذاب کہا۔ پھر تین سو برس تک اسلامی معاشرے میں اس حادثے کا ذکر نہ تھا۔ سوائے اس دلی رنج اور صدمے کے جو ایسی قیمتی اور بے بہا جانیں ضائع ہونے پر ہر مومن محسوس کرتا ہے۔ صرف اہل تشیع کے ہاں ذکر ہوتا ہوگا۔ جیسا کہ ابوحنیفہ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے اور طبری وغیرہ نے اس کی خرافات نقل کر کے اپنی تاریخ

کے اوراق سیاہ کیے ہیں۔ مگر یہ بات کتابوں کی حد تک رہی۔ اسے اہمیت تو پچوتھی صدی ہجری میں بویہی روافض نے دی جیسا کہ پچھلے اوراق میں مذکور ہوا۔ اور صفحات دہر پر ثبت ہے۔ اسی لیے اہل تشیع سے روایت لینے میں امام اعظم کی جو سختی ہے اس میں امام شافعی بھی شریک ہیں۔ جیسا کہ الکفایہ کے حوالے سے بیان ہوا۔ اب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سے یہ سختی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ (ج ۲، ص ۲۵۱، طبع مصر)

قال الشافعی فی الرافضی یحضر الوقعة لا یعطی من الفی شیئ لان
الله تعالیٰ ذکر اية الفی ثم قال والذین جاؤ امن بعدہم فمن لم یقل
بہا لا یتحقق.

[اس رافضی کے بارے میں جو غنیمت اور فنی کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا امام شافعی فرماتے ہیں کہ اسے اس میں حصہ نہ دیا جائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فنی کے بعد فرمایا ہے: جو لوگ ان کے (یعنی مہاجرین و انصار کے بعد) آئے کہتے ہیں (خدایا ہماری بھی پردہ پوشی فرما اور ان بھائیوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا تو ہی ہے دلوں میں رافت و رحمت پیدا کرنے والا) تو جو شخص یہ نہ کہے اسے (فنے میں حصہ لینے کا) کوئی حق نہیں۔]

الکفایہ فی علم الروایہ میں ہے (ص ۱۳۱) کہ حضرت عبداللہ الاخرم حافظ حدیث سے پوچھا گیا کہ امام بخاری نے ابو لطفیل عامر بن واثلہ کی کوئی روایت کیوں نہیں لی تو فرمایا لاناہ کان یفرط فی التشیع (اس لیے کہ ان میں تشیع بہت زیادہ تھا) یہ عامر بن واثلہ صغار صحابہ میں ابن الزبیرؓ اور امیر المومنین مروانؓ اؤل کے طبقے میں ہیں۔ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ اور پھر کوفہ میں رہ گئے تو ان میں تشیع آگیا۔ امام بخاری نے حضرت ابن الزبیرؓ اور حضرت مروانؓ کی روایات اور فتاویٰ صحیح میں درج کیے ہیں لیکن عامر بن واثلہ کی روایت لینے سے احتراز کیا حالانکہ ان کا تشیع محض نظری تھا اور وہ اس لیے تیار نہیں ہوئے کہ قواعد شرعیہ تو ذکر

متفق علیہ امام کی بیعت فسخ کر دیں، وہ حادثہ کر بلا کے وقت کوفے میں موجود تھے اور خروج میں حضرت حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا۔

موافق اقرباۓ حسینؑ

حادثہ کر بلا کے عینی شاہد علی بن الحسین (زین العابدین) ہیں نیز ان کے سگے بہنوئی اور ابن عم حسن بن الحسن اور دوسرے ابن عم زید بن الحسن اور تیسرے ابن عم عبید اللہ ابن العباس بن علی بن ابی طالب وغیرہ ہم۔ ان کے علاوہ سیدہ زینب بنت علیؑ تھیں جنہیں حضرت حسینؑ کا اس سفر میں ساتھ دینے کے سبب ان کے شوہر حضرت عبداللہ ابن جعفرؑ نے طلاق دے دی تھی یہ سب حضرات جب دمشق گئے اور امیر المومنین یزید سے بیعت کر کے حضرت حسینؑ کے آخری موقف کی تکمیل کر دی تو اس بیعت پر ہمیشہ قائم رہے، امیر المومنین کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے ذمہ دار رہے اور ابن الزبیرؑ سے بیعت نہیں کی۔

امیر المومنین یزید حضرت عبداللہ بن جعفرؑ کے داماد تھے یعنی ان کی دختر نیک اختر سیدہ ام محمد کے خاوند سیدہ زینب جو حادثہ کر بلا کے سبب بہت ملول تھیں جب اس پیرانہ سالی میں کہ عمر باون برس تھی دمشق گئیں تو اپنے عظیم المرتبت داماد کے حسن سلوک اور باادب ملاطفت و مدارات سے اتنی متاثر ہوئیں کہ مدینے میں واپس ہونے کے بجائے وہیں رہ گئیں اور وہیں وفات پائی۔ دمشق میں ان کا مزار مبارک زیارت گاہ خلّاق ہے۔

لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سیدہ زینبؑ کے دونوں بچے عون اور محمد کر بلا میں شہید ہوئے۔ اس سلسلے میں بہت دلدوز افسانے اور مرچھے پڑھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ عون اور محمد سیدہ زینبؑ کے دیور تھے ان میں عون الاکبر، حضرت علی کے سگے بھتیجے ہونے کے علاوہ آپ کے داماد بھی تھے، سیدہ ام کلثوم بنت علیؑ کے خاوند۔ ان کی شہادت کے بعد سیدہ ام کلثوم کا نکاح ان کے ایک بھائی حضرت محمد جعفری کے ساتھ ہوا جنہوں نے حضرت حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ کیونکہ وہ ان کی بڑی ہمیشہ سیدہ

زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ سیدہ زینب کے ایک ہی فرزند تھے جناب علی جو الزینبی کہلاتے ہیں وہ اپنے والد ماجد کے حکم سے اپنی والدہ اور اپنے ماموں کا ساتھ دینے سے رکے رہے۔ کربلا کے سفر میں ساتھ نہ گئے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عون اور محمد کو حضرت عبداللہ بن جعفر کے بھائیوں اور حضرت حسینؑ کے چچا کے فرزندوں کی حیثیت سے نہیں رویا جاتا بلکہ کذباً وافتراً سیدہ زینب کے کم سن فرزند بتا کر رویا جاتا ہے۔ گویا حضرت جعفر طیارؑ کے فرزند اس قابل نہیں کہ حضرت حسینؑ کے ساتھ شہید ہونے کے باوجود ان کا ماتم کیا جائے۔ اسی طرح خود حضرت حسینؑ کے بھی دو بھائیوں کا نام کسی کی زبان پر نہیں آتا حالانکہ وہ بھی کربلا میں شہید تھے یعنی ابو بکر اور عثمان فرزند ان حضرت علیؑ کا اس طرح تخریبی مقاصد کے تحت علم الانساب غارت کیا جاتا ہے۔

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ دمشق میں جن، سیدہ زینبؑ کا مزار ہے وہ بنت علی کہلاتی ہیں وہ ہیں تو بنت علی ہی مگر بنت الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب کی حیثیت سے جو امیر المومنین الولید الاول کی زوجہ محترمہ تھیں اگر یہ ثابت ہو جائے تب بھی یہ اس کی دلیل ہے کہ حادثہ کربلا کا کوئی اثر آل علی نے ایسا نہیں لیا جو انھیں اموی سادات سے برگشتہ کر دے بلکہ انھوں نے باہمی محبت و مودت برقرار رکھی۔ کیا یہ اس کا قطعی ثبوت نہیں کہ بنو ہاشم نے حادثہ کربلا کی ذمہ داری امیر المومنین یزید اور ان کی حکومت پر نہیں ڈالی۔ یہ حسن بن الحسن حادثہ کربلا میں موجود تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا اور وہاں کی ایک ایک بات ان کی آنکھوں دیکھی تھی لیکن نہ تو یہ امیر المومنین یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت میں شامل ہوئے جو ابن الزبیرؑ کے داعیوں نے بپا کی تھی نہ انھوں نے التوابون اور مختار ثقفی سے کوئی تعلق رکھا جو اپنے تخریبی مقاصد کے تحت یکے بعد دیگرے خون حسینؑ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہ انھوں نے بعد میں ابن الزبیرؑ سے بیعت کی۔ کیونکہ وہ مرکز خلافت دمشق کو جانتے تھے اور وہاں کے ارباب حل و عقد نے ابن الزبیرؑ کو باغی قرار دے دیا تھا پھر امیر المومنین عبدالملک کی بیعت میں داخل ہو گئے اور اپنی نور چشم کو ان کی فرزند ارجمند ولید اول کے حوالہ عقد میں دے دیا جو بعد میں دعوت محمدیہ کے عظیم

ترین علمبردار اور امام محمدیہ کے یگانہ روزگار امام ثابت ہوئے۔

حضرت حسینؒ کی شہادت سے جن حضرات کے دلوں پر سب سے زیادہ چوٹ پڑی، ان کا طرز عمل تو یہ تھا کہ امیر المومنین یزید کو اپنا امام تسلیم کرنے کے علاوہ اپنا شفیق بزرگ جانتے تھے لیکن ان کی محبت کا دم بھرنے والوں نے امیر المومنین کے خلاف وہ طوفان مچا رکھا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہل السنۃ کہتے ہیں وہ بھی اکثر اس میں بہہ گئے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری ان مصنفوں پر ہے جنہوں نے وہی روایتیں اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اہل تشیع کی روایات لینے سے احتراز نہ کیا۔ پھر وہ مصنف ہیں جو تھے تو شیعہ مگر کہتے تھے کہ اپنے آپ کو اہل السنن، اور اسی طرح انہوں نے کام کیا مثلاً محمد بن جریر طبری جو اپنی تفسیر اور تاریخ کے سبب بڑا مقام رکھتے ہیں۔ اور بعد کے لوگوں نے ان کے علمی تبحر کے سبب علمائے اہل سنت میں سمجھ لیا۔ حالانکہ ہم عصر مسلمانوں نے انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ مقابر مسلمین میں انہیں دفن کریں۔ وہ اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری بڑے محدث تھے اور اکابر علماء و فقہاء سے انہوں نے فیض لیا لیکن تھے شیعہ المذہب۔ ان کی کتاب المستدرک اس پر شاہد ہے۔ ایسی ایسی روایات کو انہوں نے اپنے مقاصد کے تحت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے جن کی کچھ اصل نہیں، ویسے ان کی کتاب معرفۃ علوم الحدیث بلند پایہ ہے اور طلبائے علم حدیث کے لیے مفید مگر اس میں انہوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ امیر المومنین معاویہؓ کا اسم گرامی نہ آنے پائے۔ ان کا فرض خلفائے ثلاثہ کے بارے میں نہ تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھ انہوں نے بڑی عقیدت ظاہر کی ہے۔ البتہ اموی خانوادے سے نفرت کے ذریعے انہوں نے اپنا کام چلایا ہے۔ حالانکہ اس عہد کے مسلمان اہل السنن میں انہیں سمجھتے تھے جو حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی وہی عقیدت رکھیں جو خلفائے ثلاثہ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ محمد بن ابی طاہر ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۳، ص ۶۸، طبع مصر)

انه كان شديد التعصب في الباطن وكان يظهر التسنن في التقديم

والخلافة وكان مخبراً غالياً عن معاوية واهل بيته يتظاهرون به ولا يتغذرون منه.

اُوہ باطن میں شیعی تعصب رکھتے تھے اور ظاہر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو مقدم رکھتے تھے اور خلافت کی اسی ترتیب کے قائل تھے لیکن حضرت معاویہؓ اور ان کے گھرانے سے سخت روگرداں تھے، برملا اس کا اظہار کرتے اور اس پر انفعال محسوس نہ کرتے۔]

امام السبکی نے ان کی طرف سے بڑی صفائی پیش کی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ انھوں نے دلیل یہ قائم کی ہے کہ جن بزرگواروں سے الحاکم کو فیض ہے ان کا فیض یافتہ شخص رافضی نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ دلیل کمزور ہے دیکھنا تو خود اس شخص کے عمل کا ہے کہ اپنے اساتذہ کے طریقے پر قائم رہا یا اس سے ہٹ گیا۔ ان کی کتابوں سے ان کا تشیع پوری طرح ظاہر ہے۔ المسعودی نے بھی اجلہ و اکابر سے تحصیل علم کی حتیٰ کہ اموی علماء سے بھی، مگر کٹر رافضی تھے۔ مروج الذهب اس پر گواہ ہے۔ اس میں اصحاب رسول ﷺ پر اس قدر جھوٹ بولے گئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں (منہاج السنہ، ج ۲، ص ۱۳۱) وفی تاریخ المسعودی من الاکاذیب مالا یحصىہ اللہ تعالیٰ (مسعودی کی تاریخ میں اتنا جھوٹ ہے کہ اس کا شمار بس اللہ تعالیٰ ہی جانے) لیکن سیوطی جیسے لوگ جنہیں تحقیق سے کچھ مس نہ تھا محض حاطب اللیل تھے۔ انھوں نے اہل السنہ میں ہونے کے باوجود تاریخ الخلفاء میں ایسی لغویات بھر دیں کہ بہت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان اکاذیب کے ذریعے وقائع تاریخی کی صورت مسخ کر دی گئی ہے اور اکابر امت کے بارے میں ایسی خرافات کو شہرت دی گئی ہے اور ایسے ایسے انداز میں ان اباطیل کو بیان کیا جاتا ہے کہ اہل السنن بھی ناواقفیت کے سبب غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے امام اعظم ابوحنیفہ نے اہل تشیع کی روایات سے محترز رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنا مذہب یہ رکھا ہے کہ جملہ صفین کی طرح حادثہ کربلا کے بارے میں سکوت کیا جائے اور جن امور میں صحابہ کرام ملوث ہوں ان

میں فریق بننے سے گریز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اور وحدت امت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔

دعوت عباسیہ اور آل عبد مناف ابوطالب

امیر المومنین سیدنا معاویہؓ نے صحیح بنیاد پر یہ اہتمام کیا تھا کہ خلافت اسلامیہ کو خالص عربی حکومت رکھیں تاکہ غیر عرب نو مسلم حکومت میں داخل ہو کر دعوت محمدیہ کو مخ نہ کر سکیں کیونکہ مجوسی، یہودی اور نصرانی لوگوں کو اپنی اپنی ثقافت پر بہت غرہ تھا یہ بات بڑی خطرناک ہوتی اگر انھیں محض اسلام قبول کرنے کے سبب حکومت میں شریک کر لیا جاتا۔ اسی حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مملکت اسلامیہ مستحکم رہی اور دین مبین اپنی خالص شکل میں محفوظ رہا۔ لیکن ساٹھ ستر برس کی مدت میں نو مسلموں کے دلوں میں یہ جذبہ رہ رہ کر ابھرتا تھا کہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کے بجائے انھیں بھی حاکمانہ اقتدار میسر آئے۔ آخر عہد اموی میں یہ صورت حال شدت اختیار کر گئی اور وقت آگیا تھا کہ اب حکمت عملی میں تبدیلی لائی جائے۔

قبیلہ قریش میں بنو امیہ کے بعد یہ درجہ بنو ہاشم کا تھا کہ قیادت کے لیے آگے بڑھیں۔ بنو ہاشم میں سے آل علی کی سب تدبیریں پہلے ہی کئی بار ناکام ہو چکی تھیں اور جو گروہ اپنے آپ کو ان کا حمایتی کہتا تھا اس کا کردار ایسا رہا کہ علویہ کی جانیں تو ضائع ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر ایک بات یہ تھی کہ آل علی کے سامنے سوائے حصول حکومت کے اور کوئی عمرانی منصوبہ نہ تھا۔ ان کے تمام خرو جوں میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ خلافت و حکومت پر وہ اگر فائز ہو جاتے تو ان کا لائحہ عمل کیا ہوتا۔ ان میں جو بھی کھڑا ہوا اس نے صرف نسبی تعلیوں کا سہارا لیا اور کوئی بات ایسی پیش نہ کی جس کے سبب لوگ اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو سکیں۔ علویہ کی حمایت میں یا ان کا قصاص لینے کے بہانے جو لوگ کھڑے ہوئے ان کا مطلق نظر صرف فساد تھا۔ اسی لیے جمہور صحابہ و آل البیت نے انھیں ملت کا دشمن قرار دیا۔

حضور اکرم ﷺ سے اقربیت کے دعوے سے کھڑے ہونے والے ایک طرف آل

عباسؒ تھے اور دوسری طرف حضرت علیؑ کی فاطمی اولاد آل علی کی ناکامیوں کے سبب آل عباس نے اپنی تحریک ان سے الگ رکھی حالات حاضرہ کے تحت اب ذمہ داری بھی انھی کی تھی کہ امت کی سربراہی اور دعوت محمدیہ کی حفاظت و آبیاری کا انداز ایسا رکھیں کہ وحدت امت پیدا ہو۔ یوں یہ عظیم الشان دعوت شروع کی گئی جس نے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ اور وہ نظام بروئے کار آیا جسے چلانے کے لیے تمام کلمہ گو صدیوں تک برابر کے حصے دار بنے رہے۔ سب اہل تحقیق متفق ہیں کہ اس عجیب و غریب اور کامیاب ترین دعوت کا اجرا ۱۰۰ھ میں ہوا اور یہ زمانہ امیر المومنین عمر ثانی اموی کا تھا۔

حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے حضرت محمد الامام عباسی نے اپنے داعیوں کو حکم دے دیا تھا کہ حجاز اور عراق میں کام نہ کریں بلکہ ابتدا خراسان سے کی جائے۔ حجاز میں تحریک کی ضرورت نہ تھی اور عراق میں کام شروع کرنے کا مطلب ہوتا کہ چھوٹے ہی دعوت کو تعمیر رکھنے کے بجائے تخریبی بنادیا جائے۔ چنانچہ عباسی داعیوں نے شرق و غرب میں ہر زاویہ نگاہ سے محنت کر کے رائے عامہ اپنے حق میں استوار کی۔ جو لوگ ہموار ہو جاتے ان سے بیعت لی جاتی تھی کہ امام کے ظہور پر ان کا ساتھ دیں گے۔ یعنی اس بات کا اہتمام تھا کہ خلیفہ وقت کی بیعت توڑنے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑنے کی ترغیب نہیں دی جاتی تھی۔ بیعت آئندہ کے لیے لی جاتی تھی اور اس طرح قواعد شرعیہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ خراسان میں کام مکمل کرنے کے بعد سب سے آخر میں عراق پر توجہ کی گئی۔ امام اعظم اور امیر ہبیرہ کے عنوان کے تحت صورت حال بیان کی جا چکی ہے، اس وقت حال یہ تھا کہ چاروں طرف عرب قبائل خصوصاً مضری و یمنی عرب آپس میں ایسے دست و گریباں تھے جیسے ان کا کوئی سربراہ نہ ہو۔ ہر طرف شورش اور خون خرابہ تھا، ان فتنوں میں عباسی داعیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور نہ انھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف کوئی علانیہ حرکت کی۔ البتہ امت کی اس خانہ جنگی سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہر جگہ اپنے ہمنوا پیدا کیے۔ اور سب پر ثابت کر دیا کہ اختلال کی یہ صورت اس وقت رفع ہوگی جب آل بیت نبوت میں سے بنو العباس کے ہاتھ میں زمام کار آئے گی

کیونکہ ہمارے امام کی دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کو عربی رکھنے کے بجائے تمام مسلمانوں کو اس میں نمائندگی دے دی جائے اور ہر علاقے کے مسلمانوں کو اندرونی آزادی و خود مختاری حاصل ہو۔

اس حسن سے تعمیری انداز میں یہ تحریک چلائی گئی اور کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ صحیح ہے کہ داعیوں نے اپنے مقاصد کے تحت جوڑ توڑ سے بھی کام لیا۔ لیکن یہ انتشار کو ہوا دینے کے لیے نہ تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ اسی انتشار کو وجہ اختلاف بنایا جائے۔ لوگوں نے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اہل خراسان کی فوجی طاقت کے ذریعے عباسیوں نے ملت اسلامیہ پر اپنا تسلط قائم کیا اور بزور شمشیر حکومت پر قابض ہو گئے۔ گویا ان کے نزدیک خراسانی لوگ اتنے ہیبت ناک تھے اور ایسے ایسے تباہ کن آلات و حرب کے مالک کہ پورے عالم اسلام کو انھوں نے زیر کر لیا اور وہ بھی دوسری صدی کے مسلمانوں کو جن سے ہر بالغ شخص ہتھیار بند تھا اور ماہر حرب و ضرب۔

اگر ان پر پکینڈا کرنے والوں میں تھوڑی سی بھی بے تعصبی ہوتی اور امت مسلمہ کی روح کا انھیں ادراک ہوتا، جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں جھکتی، تو ایسی بات نہ کہتے عباسیوں کا تسلط اس لیے قائم ہوا کہ احوال حاقرہ سے امت نالاں تھی۔ اور چاہتی تھی کہ فتنہ و فساد رفع ہو کر یک جہتی آئے کیونکہ اموی حکمت عملی اب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ اور ہر جگہ کے لوگ حکومت میں برابر کا حصہ چاہتے تھے۔ اس طرح انقلاب کے لیے فضا ہموار تھی اور قدرتی بات تھی کہ لوگوں کی نگاہیں نبی ﷺ کے گھرانے کی طرف اٹھیں۔ آل علیؑ کے عقیق اور بے نتیجہ اقدامات کے مقابلے میں صرف آل عباسؑ تھے جن کا پیغام تعمیری تھا اور جن کی تحریک میں آزادی اور مساوات کی بشارت تھی۔ چنانچہ ہر جگہ کے مسلمان ان کی طرف جھکتے چلے گئے اور انھی کو امت کا نجات دہندہ سمجھا۔

عباسی امام نے ظہور اس وقت فرمایا۔ جب فضا انقلاب کے لیے تیار ہو گئی، امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا اور خود اموی خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ یوں تو زوال کے آثار امیر المومنین ہشام کی آنکھ بند ہوتے ہی نمودار ہو گئے تھے۔ ایسے ہی جیسے اورنگ زیب عالمگیر کی

وفات کے بعد ہندوستان میں ہوا۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ آخری متفق علیہ خلیفہ ولید ثانی کو ۱۲۶ھ میں افراتفری اور کذباً بدترین الزامات لگا کر شہید کر دیا گیا اور یوں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلا کر اس گھرانے نے طوائف الملوکی کی صورت پیدا کر دی۔ اس ہنگامے کے بعد جناب مروان ثانی نے خاندانی اختلال پر قابو پا کر معاملات سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنی انسانی فضیلتوں مومنانہ خصالتوں اور قائدانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ نہ ایسی مقبولیت حاصل کر سکے اور نہ اتنی مادی طاقت کا اختلال دور کر سکیں اور مرکزیت پیدا ہو جائے۔ حالات ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ ان کی بیعت ۱۲۷ھ میں ہوئی مگر اس سے پہلے ہی عباسی داعی میدان میں کھل کر سامنے آچکے تھے اور اسی سال خراسان میں عباسی امام کی بیعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا یعنی مروان ثانی کی آئینی حیثیت انھیں تسلیم نہ تھی کیونکہ اس کا انعقاد عباسی امام کی بیعت کے بعد اور اختلافی ماحول میں کیا گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ دمشق کے قرب وجوار کے علاوہ امویوں کا اقتدار جاتا رہا تھا اور کامیابی کے وسائل کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اس صورت حال سے پریشان ہو کر اور عباسی داعیوں کی روز افزوں کامیابیاں دیکھ کر امویوں کے ایک طرف دار علواں بن المقتنی نے وہ مشہور اشعار مروان ثانی کو لکھ بھیجے جن سے اموی موقف کی کمزوری اور ان کی سیاسی زبوں حالی عیاں ہے۔ ان کے اس مخلص کو اس صورت حال کا کوئی مداوانظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ انجام کی پروا کیے بغیر مردوں کی طرح جان کی بازی لگا دی جائے۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۵، ص ۱۱۱، طبع مصر) اس منظوم خط میں وہ کہتے ہیں:

فقل لبني امية ليت شعري	ایقظ امیۃ ام ینام
وقد ظهر الخراسانی معه	بنو العباس والجیش للہام
فان لم تجمعوا جيشا يضيق ال	عراق علیہم والشام
فلا قوہم کمالا فی علیاً	بصفین معاویۃ الہمام
وکان علی قوی منہ عزماً	واعلی رتبۃ وهو الامام

ولا ياخذكم حذرو وخوف فما يغنى اذا حام الحمام
 | بنو امیہ سے کہہ دو کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اموی خاندان جاگ رہا ہے یا بخواب
 ہے۔ خراسانی ظاہر ہو گیا ہے اور اس کی پشت پر بنو عباس ہیں اور عظیم الشان لشکر۔
 اگر تم لوگ اتنا لشکر جمع نہ کر سکو جو عراق اور شام کی سرزمین ان پر تنگ کر سکے۔ تو
 ان سے اسی طرح بھڑ جاؤ جیسے (وسائل کی کمی کے باوجود) عظیم المرتبت معاویہ
 (حضرت علیؓ) سے متصادم ہو گئے تھے۔ حالانکہ (حضرت) علیؓ اپنے عزائم میں ان
 سے زیادہ قوی تھے ان کا رتبہ بلند تھا اور وہ خلیفہ تھے۔ اور تم پر ڈر اور خوف مستولی نہ
 ہو۔ جب میدان کارزار گرم ہو جائے تو پھر پروا کا ہے کی۔]
 پھر کہتا ہے:

فموتوا في ظهور الخيل صبراً كما قدمت قبلكم الكرام
 ولا تتدرعوا اتواب ذل وعار قد تدرعها اللئام
 [تو گھوڑوں کی پیٹھوں پر اسی طرح استقلال سے جان دو جیسے تم سے پہلے غیرت
 مند لوگ جان دے چکے ہیں۔ ذلت اور عار کا لبادہ مت اوڑھو۔ کیونکہ یہ لبادہ
 تو پست فطرت و دوہمت لوگ اوڑھا کرتے ہیں۔]

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اموی خلافت کے احوال دگرگوں ہو چکے تھے
 اور وقت آ گیا تھا کہ انجام سے بے پروا ہو کر وہ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں اور ان
 اشعار سے یہ بھی عیاں ہے کہ جس حزم و عزم کے ساتھ دعوت عباسیہ جاری کی گئی اور اسے قبولیت
 عام حاصل ہوئی اس کا انجام یہ ہونا تھا کہ فتح سے ہم کنار ہوں اور اموی خلافت کا تختہ الٹ جائے۔
 جناب مروان ثانی نے ان اشعار کے جواب میں لکھا تھا: الحاضر بوی مالا یری
 الغائب (جو حاضر ہو وہ ان باتوں کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھ سکتا) یعنی تمہیں کیا معلوم میں
 کن مشکلوں میں پھنسا ہوا ہوں یعنی ایسے مایوس کن حالات سے دوچار تھے۔

دعوت عباسیہ کے سلسلے میں ایک خود ساختہ تصور کو اس طرح پھیلایا گیا ہے کہ عباسیوں کی تحریک بنو امیہ کے خلاف تھی۔ اور مقصد یہ تھا کہ ان علویوں کے خون کا بدلہ لیا جائے جو اموی عہد میں اپنے خروجوں کے سلسلے میں مقتول ہوئے تھے۔ اسی لیے عباسیوں نے سیاہ ماتمی لباس اختیار کیا اور جھنڈا بھی اپنا سیاہ رکھا۔ بعض افسانہ نگاروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دراصل یہ تحریک علویہ کی تھی اور ان کی ہمدردی میں عباسی لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن جب کامیابی حاصل ہو گئی تو خلافت علویوں کے سپرد کرنے کے بجائے خود اس پر قابض ہو گئے۔ یہ تصور وہی ہے جو شکست خوردہ تدبیر نامقبول لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔

عباسیوں کو علوی مقتولوں کا بدلہ لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ خروج اور اقدامات ان کی رائے کے خلاف کیے گئے تھے اور قواعد دینیہ کے تحت ان کی کوئی گنجائش نہ تھی، پھر دیکھنا ہے کہ حضرت حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے اؤل التوابون کھڑے ہوئے اور پھر مختار ثقفیؒ لیکن بنو ہاشم نے ان دونوں فتنوں سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ سخت بیزاری ظاہر کی۔ بنو ہاشم تو اس زمانے میں بنو امیہ کی خلافت کے ایسے حامی تھے کہ انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی اور منتظر رہے کہ امیر المومنین عبدالملک کامیاب ہوں تو ان سے بیعت کی جائے۔ کیونکہ امت کا اختلاف رفع کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی قابلیت اسی یگانہ روزگار بطل جلیل میں تھی اور آئینی حیثیت سے موقف بھی انھی کا صحیح تھا۔ کیونکہ خلافت میں ارباب حل و عقد کے عام اجتماع میں مروانی خلافت پر اجماع ہوا تھا۔ برخلاف اس کے ابن الزبیرؓ کا موقف کمزور تھا۔ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ ان کے ادعائے خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے متفق علیہ امام امیر المومنین یزید سے بیعت نہیں کی تھی اور صحابہ کرام کی اجماعی فیصلے کی بے وقعتی کر کے اختلاف پیدا کر رکھا تھا۔ انھیں جو تھوڑی سی وقتی کامیابی نصیب ہوئی تو محض اس لیے کہ کھل کر اپنی خلافت کا اعلان انھوں نے امیر المومنین یزید کی وفات کے بعد کیا تھا، اسی لیے بعض صغار صحابہ ان کے

ساتھ ہو گئے تھے۔ مگر ان کا زمانہ کہلاتا ہے ”فتنوں کا زمانہ“ صحاح میں جہاں کہیں اس دور کا ذکر ہے تو ”فتنہ ابن الزبیر“ ہی کی حیثیت سے ہے۔

صحیح بخاری میں ابن الزبیر اور امیر المومنین عبدالملک کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول موجود ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا (ج ۳، کتاب التفسیر، باب قولہ ثانی اثنین اذ ہمائی الغارص، ۱۳۶، طبع مصر)

ان ابن ابی العاص برز یمشی القدمیہ یعنی عبدالملک بن مروان
وانہ لوی ذنبہ یعنی ابن الزبیر۔

[ابوالعاص کے فرزند مردانہ وار بڑھ رہے تھے یعنی عبدالملک بن مروان، اور یہ جو صاحب ہیں تو انھوں نے اپنی دم سیکڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیر اگر ابن الزبیر کو بنو ہاشم اور اکابر صحابہ کی حمایت حاصل ہوتی اور ان کی خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہوتی۔ تو پھر اہل شام کی کامیابی کا امکان نہ تھا۔ اور وہ باغی اور خارجی قرار پاتے۔]

رہا زید بن علی بن الحسین کا خروج تو اس کا بھی یہی حال تھا کہ ہاشمی گھرانے کے کسی ایک فرد نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ ہر طرح کوشش کی کہ سبائیوں کے بہکائے میں آکر مفتق علیہ امام کی بیعت توڑنے سے احتراز کریں پھر ان کا بدلنے لینے کا تصور عباسیوں کے ہاں کیوں پیدا ہوتا اور وہ اپنی عوامی تحریک کو خاندانی چپقلش بنا ڈالنے کی غلطی کیوں کرتے۔

عباسیوں کی تحریک خاندان بنو امیہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ ان کے سیاسی نظام کے خلاف ایک عوامی تحریک تھی اور اس کا علویہ سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ یہ اہتمام رکھا گیا تھا کہ جو لوگ علویہ کے حمایتی کہلاتے تھے انھیں اس تحریک سے دور رکھا جائے۔ یہ تحریک اس غرض سے چلائی گئی تھی کہ خلافت کو عربی رکھنے اور غیر عرب مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کے سبب عوام میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ امویوں کی جگہ اگر اس وقت کوئی اور خاندان ہوتا تب بھی یہ تحریک اسی طرح چلائی جاتی۔ کیونکہ امت کے احوال ایک عظیم الشان انقلاب کے متقاضی تھے۔ اور

ضروری ہو گیا تھا کہ عباسی امام کے حق میں رائے عامہ استوار کی جائے، اسباب فراہم کیے جائیں اور موزوں وقت پر اقدام کیا جائے کہ کامیابی متوقع ہو۔

سیاہ رنگ

عربوں میں نہ پہلے سیاہ رنگ کو ماتمی سمجھا جاتا تھا اور نہ آج سمجھا جاتا ہے۔ اس رنگ کو ماتمی ہونے کا تصور عجیب ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دو جھنڈے تھے۔ ایک سیاہ جو غل کہلاتا تھا (سایہ) اور ایک سفید جسے صحاب کہتے تھے (بادل) اموی خلافت میں سفید رنگ اختیار کیا گیا اور عباسی خلافت میں سیاہ۔ اور یہ دونوں رنگ اتباع سنت میں اختیار کیے گئے تھے۔ سیاہ رنگ کو ترجیح دینے کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی فاتحانہ شان کی تکمیل فتح مکہ سے ہوئی اور اس وقت سیاہ عمامہ آپ زینب سر کیے ہوئے تھے۔ پھر غزوہ تبوک تھا جس کی اہمیت قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے۔ اس غزوے نے اہل ایمان کا ایمان اور اہل نفاق کا نفاق ظاہر کر دیا۔ اس مہم کی قیادت خود سرور کائنات ﷺ نے کی تھی۔ اس غزوے میں آپ کا جھنڈا سیاہ تھا اور آپ کے علمبردار تھے حضرت صدیق اکبرؓ (ابن عساکر، ابن ہشام، طبقات ابن سعد) پھر الاصابہ فی تمییز الصحابہ میں ہے (ج ۲، بذیل سعد بن مالک) کہ حضرت سعد بن مالک ابو الکود کو آپ نے جو جھنڈا عطا فرمایا تھا وہ سیاہ تھا اور اس پر سفید ہلال کا نقش تھا۔ (رایتہ سودا، فیہا ہلال ابیض)

غرض یہ ہے کہ نجی توجہیات بے اصل ہیں۔ ماتم داری کیا کرتے ہیں شکست خوردہ ناکام لوگ۔ کامیاب و کامراں اصحاب عزیمت کو ماتم داری سے کیا واسطہ۔ وہ اگر وقتی طور پر ناکام ہو جائیں تب بھی ان کے ہاں رونا پیٹنا نہیں بلکہ نئے عزم اور نئے ولولے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رسم تو چوتھی صدی ہجری میں مجوسی الاصل بویہی خاندان کے معز الدولہ نے اس وقت جاری کی جب وہ اور اس کے اہل خاندان امور خلافت پر مستولی ہو گئے۔ اور طاقت کے بل پر زندقہ والحاد کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سبائیوں نے اموی و عباسی خلافت کے سرکاری رنگ

سفید سیاہ کے مقابلے میں سبز رنگ بعد میں اختیار کر لیا تھا جو مجوسی معبد کے جھنڈے کا رنگ تھا۔

اموی سادات

انقلاب حکومت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ میں اموی سادات کے ساتھ عموماً اور خانوادہ خلافت امویہ کے ساتھ خصوصاً عباسی خلفا کا برتاؤ اس صلہ رحمی پر مبنی تھا جس کے وہ حق دار تھے۔ تاریخ میں ان بیسویں اموی بزرگوں کے اسمائے گرامی محفوظ ہیں۔ جنہیں خلافت کے اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور انہیں خلفائے عباسیہ کے ہاں وہی برادرانہ تقرب حاصل تھا جو جاہلیت اور اسلام میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ہمیشہ قائم رہا۔ یہ موضوع بہت طویل ہے۔ مختصراً چند حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں اور اس سے اندازہ لگے گا کہ عباسیوں کی تحریک کسی خاندانی یا نسلی پست جذبے کے تحت نہ تھی بلکہ ملت کی خیر خواہی اور امت کے ارتقاء کے لیے اسے جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خلافت قائم ہونے کے بعد اس دعوت کی آبیاری میں ان تمام حضرات کو شریک کیا گیا جو اس کے اہل تھے۔ اور ملی فرائض کا انہیں احساس تھا۔ جو لوگ دعوت محمدیہ کے علمبردار ہوتے ہیں ان کے ہاں نسلی، لسانی، ملکی اور ایسے ہی دوسرے زمینی امتیازات کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔

اب ملاحظہ ہوں اموی خانوادہ خلافت اور دوسرے اموی سادات کے اسمائے گرامی اور عباسی خلفاء کے ساتھ ان کے تعلقات خصوصی۔

۱۔ عبدالعزیز بن امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز: یہ اموی بزرگ، آخری اموی خلیفہ جناب مروان ثانی کے عہد میں والی مدینہ تھے۔ امیر المومنین المنصور نے انہیں اپنا ندیم بنایا۔ چنانچہ وہ ان کے مخصوص لوگوں میں سے تھے، سیاہ سرکاری لباس پہنتے و کسان فی صحابۃ ابی جعفر المنصور خاصاً بہ ممن یلبس السواد و یلازمہ حیث کان ر (ابن حزم جہرۃ الانساب، ص ۹۷)

۲۔ انھی مروان ثانی کی صاحبزادیاں اور اعزہ مصر میں تھے ان کی شہادت کے بعد

انھیں سب کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن حِراں بھیجوا دیا گیا اور ان کے لیے پیش قرار وظیفہ مقرر کر دیا۔ امیر المومنین المہدی نے اس وظیفے میں اور اضافہ کر دیا۔ (ہسٹری آف سیرسینز، ص ۱۸۳، مطبوعہ ۱۹۴۹ء)

۳۔ اموی سادات کے جو خاندان کوفے اور بصرے میں آباد تھے ان کے ساتھ امیر المومنین ابو جعفر المنصور نے رشتہ مناکحت استوار کیا، آپ کی یہ اموی زوجہ محترمہ خالد بن اُسید بن ابی العیص بن امیہ کے اخلاف میں سے تھیں اور ان سے آپ کے دو فرزند پیدا ہوئے علی و عباس اور ایک دختر عالیہ (دوسری اموی خاتون سے اپنے فرزند ارجمند امیر جعفر کا نکاح کیا۔ جو سیدہ زبیدہ کے والد ماجد ہیں۔ پھر اپنے دوسرے فرزند اور ولی عہد امیر محمد المہدی کا نکاح سیدہ رقیہ بنت عمرو بن خالد بن عبد اللہ بن امیر المومنین عثمانؒ سے کیا اور ان سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایسے ہی اور بھی رشتے قائم کیے۔

۴۔ حضرت یحییٰ بن سعید بن ابان ابن سعید بن العاص اموی خلیفہ جو بلند پایہ محدث تھے اور کوفے کے ساکن، انھیں اپنے پاس بغداد بلایا۔ اور اپنی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔

۵۔ عبد اللہ بن عاصم بن امیر المومنین عمر بن عبد العزیزؒ کو امیر المومنین محمد المہدیؒ نے مسجد نبویؐ کی توسیع کا متولی بنایا۔ امیر جعفر بن سلیمان عباسی اس وقت والی مدینہ تھے۔ (فتوح البلدان، ج ۱، ص ۲۷ ترجمہ)

۶۔ آل امیر المومنین عبد الملک۔ طبری اور ابن خلدون وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ امیر المومنین المہدی کا گزر امیر مسلمہ بن امیر المومنین عبد الملک کے قصر پر ہوا، تو ان کے عم بزرگوار عباس بن علی السجاد نے بتایا کہ جب حضرت محمد الامام اس طرف آئے تھے تو امیر مسلمہ نے ان کی ضیافت کی تھی اور چار ہزار دینار نذر کیے تھے۔ امیر المومنین نے حضرت مسلمہ کے فرزندوں کو طلب فرما کر بیس ہزار دینار مرحمت فرمائے اور ان کا پیش قرار وظیفہ مقرر کیا۔ ان کی نسل کے لوگ بنی مسلمہ سے معروف ہیں اور ان کے بعض حامل آثار خاندان مصر کے علاقے ”الاشموین“ میں آباد ہیں۔ (الاعلام زرکلی، ج ۸، ص ۱۲۲)

۷۔ طبری اور ابن خلدون نے بتایا ہے کہ ۱۲۵ھ میں حبشیوں نے مدینے میں جولوت مار کی اور فساد کیا تو اس وقت مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کے لیے ایک اموی نوجوان بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے امامت کے لیے بڑھے میں الاصغ بن سفیان بن عاصم بن عبدالعزیز بن مروان ہوں اور امیر المؤمنین ابو جعفر کی اطاعت کے ساتھ تم کو نماز پڑھاتا ہوں۔ (طبری، ج ۳، ص ۲۵۳)

۸۔ علی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن حضرت معاویہؓ جو السفیانی کہلاتے تھے اور مادری نسب میں عباس بن علیؓ بن ابی طالب کے نواسے تھے دمشق میں مسکن گرین تھے، خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں علم بغاوت بلند کیا اور ۱۹۵ھ میں مارے گئے۔ (الاعلام زرکلی، ج ۵، ص ۱۷۱ دیگر کتب)

۹۔ ابومروان محمد بن عثمان اموی۔ آپ امیر المؤمنین المعتمد باللہ اور ان کے فرزند امیر المؤمنین الواثق باللہ کے زمانے میں مکہ معظمہ کے قاضی تھے (جمرة الانساب، ص ۷۸)

۱۰۔ بغداد کا عہد لیہ اور اموی قضاہ۔ امیر المؤمنین جعفر المتوکل علی اللہ کے عہد سے لے کر ڈھائی سو برس تک بغداد کے عدلیہ پر اموی سادات فائز رہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں:

(جمرة الانساب، ص ۱۰۵)

والقضاء فی بغداد متردد فی بنی ابی عثمان بن عبداللہ بن خالد بن
أسید بن ابی العیص بن امیة من عهد المتوکل الی زماننا هذا وھم
ابی الشوارب.

[بغداد میں عہدہ قضا (امیر المؤمنین) المتوکل علی اللہ کے عہد سے ہمارے زمانے
تک ابی عثمان بن عبداللہ بن خالد ابن أسید بن ابی العیص بن امیہ کے خاندان
میں متوارث چلا آتا ہے۔ یہ لوگ بنو ابی الشوارب کہلاتے ہیں۔]

ان میں علی بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی الشوارب اور محمد بن عبداللہ اموی بغداد
کے قاضی القضاۃ تھے۔ اسی طرح العاص بن محمد اموی بصرے کے قاضی تھے۔ علامہ ابن کثیر نے
۴۱۰ھ کے واقعات میں ابوالحسن احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباس بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی

الشوارب القرشی الاموی کو قاضی القضاۃ بنایا ہے۔ بغداد میں وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بڑے فاضل و زاہد تھے بارہ برس قاضی القضاۃ رہے۔ بصرے میں دوسرا اموی خاندان حضرت ابوسفیانؒ کے فرزند عتبہ کی اولاد میں تھا۔ ان میں مشہور ادیب و مصنف محمد بن عبداللہ بن عمرو ابو عبدالرحمن اموی العتبی تھے (م ۲۲۸ھ) ان کے جد اعلیٰ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کے بھائی عتبہ کی نسل میں ایک مشہور عالم و مصنف محمد بن احمد بن محمد بن اسحاق بن الحسین بن المنصور بن معاویہ بن محمد بن عثمان بن عتبہ بن ابوسفیان تھے جو بقول علامہ ابن کثیر لغت و انساب کے عالم انساب العرب پر ان کی تالیف ہے وہ خراسان کے ابی درد مقام کے ساکن تھے۔ اس شہر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ المؤتلف والمختلف پر ان کی کتاب بھی ہے ۵۰ھ میں وفات ہوئی (البدایہ، ج ۱۲، ص ۱۷۶) ایسے ہی علماء و فضلاء اس دودمان عالی شان کے عراق و شام وغیرہ میں آباد تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سعید بن عبدالملک بن مروان جن کی کنیت ابوصفوان تھی۔ امیر المومنین عبدالملک کے پوتے ہیں۔ یہ دمشق میں رہتے تھے، کتاب النوادر کے مصنف ہیں ۱۵۴ھ میں بعہد امیر المومنین المنصور وفات پائی۔

اموی دودمان عالی شان کے بڑے بڑے علماء اور اولیاء اللہ عہد عباسی میں مشہور نام تھے۔ اور ان کے فیوض سے یہ امت بہرہ ور تھی مثلاً ابوالولید حضرت حسان بن محمد بن احمد بن ہارون بن حسان بن عبداللہ بن عبدالرحمن بن عنبسہ بن سعید بن العاص القرشی الاموی۔ جو خراسان میں امام اہل حدیث تھے اور مرجع خلافت۔ ان کی پیدائش کی بشارت ان کی والدہ ماجدہ کو خواب میں ملی تھی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں انھیں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ ابوالحسن بن عبداللہ بن محمد الفقیہ فرماتے ہیں: ”مجھ پر اگر کوئی علمی مشکل پیش آتی یا دینی کوئی پریشانی ہوئی تو میں حضرت ابوالولید کے مزار پر حاضر ہوتا اور ان کے توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تو میری مشکل حل ہو جاتی تھی (طبقات الشافعیۃ الکبری، ج ۲، ص ۱۹۱-۱۹۲، طبع مصر) ۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۴۹ھ میں وفات پائی۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی انقلاب میں جتنا کشت و خون ہوتا ہے اس انقلاب میں بھی

ہوا۔ لیکن لوگوں نے عجیب و غریب بہیمانہ حرکتیں عباسیوں سے منسوب کر دی ہیں کہ چن چن کر ایک ایک اموی کو قتل کیا گیا اور خلفائے پیشین کے مزارات کی بے حرمتی کی گئی۔ امیر المومنین ہشام کی لاش قبر سے نکال کر سولی پر لٹکائی گئی، اس کو کوڑے مارے گئے اور پھر جلا دیا گیا۔ اسی طرح ۷۰، ۸۰ اموی سادات کو قتل کر کے ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا دسترخوان کیے بچھایا اس کا ذکر نہیں۔ یہ حد درجہ مکروہ و بے بنیاد روایت سب سے پہلے ابوحنیفہ جیسے مؤلف نے جسے سب ہی ائمہ رجال نے کذاب بتایا ہے اپنی کتاب میں درج کی تھی اسی کذاب راوی سے بعد کے مؤلفین تحقیق کی آنکھ بند کر کے نقل درنقل کرتے رہے ہیں۔

اسی قسم کی ایک لرزہ خیز روایت طبری نے یہ لکھی ہیں کہ جب امیر المومنین المہدیؑ نے مسند خلافت کو رونق بخشی تو انھوں نے قصر خلافت میں ایک کمرہ دیکھا جو مقفل رہتا تھا۔ انھیں تجسس ہوا کہ اس کمرے میں کیا ہے، اسے کھلوا دیکھا کہ بے شمار آدمیوں کی کھوپڑیاں صاف کی ہوئی رکھی ہیں اور ہر ایک پر پرچی لگی ہوئی ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔ آپ یہ منظر دیکھ کر لرز گئے اور سب کو دفن کرا دیا۔ یعنی بیٹے کو جو ولی عہد بھی تھا یہ خبر نہ تھی کہ ابا جان کیا حرکتیں کیا کرتے تھے۔ آخر لوگوں کا قتل ہونا ان کی کھوپڑیوں سے کھال اتارنا اور صفائی کرنا۔ پھر کوٹھری میں قریب سے رکھنا اور نشیوں کا بیٹھ کر ہر ایک کے نام کی پرچی لگانا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ سب کام ایسے چپ چاپاتے ہوتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ بیٹوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ لکھنے والوں نے یہ لغوبات اپنے مقاصد کے تحت لکھیں، لیکن شرم انھیں نہیں آتی جو حوالے دے کر انھیں بیان کرتے ہیں اور باور کرانا چاہتے ہیں کہ قصر خلافت امید گاہ انام نہیں تھا بلکہ بوچڑ خانہ تھا۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

انقلاب کی ایک بات امیر عبدالرحمن الداخل اموی کی دیکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے ہسپانیہ جا کر یہ باتیں کیوں نہیں بیان کیں اور وہاں کے مصنفوں نے انہیں کیوں نہیں لکھا۔ حالانکہ انھیں خوب نمک مرچ لگا کر لکھنا چاہیے تھا۔ یہ سب روایتیں سبائی راویوں کی بیان کردہ اور شیعی مصنفوں کی اپنی کتابوں میں درج کردہ ہیں جنھیں دوسرے نقل درنقل کرتے چلے جاتے

ہیں۔ اور عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ ہمیں تو یہ ملتا ہے کہ جب حضرت امیر الداخل ہسپانیہ متمکن ہو گئے تو اپنے اہل و عیال کو دمشق سے بلوایا۔ اگر خانوادہ خلافت کے ایک ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا تو یہ کیسے بچ گئے، پھر جو لوگ مزارات اکھاڑ پھینکنے اور لاشوں پر تازیانے برسانے والے ہوں، مردوں کی ہڈیاں جلوانے والے ہوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھائیں۔ ان کی بہیمانہ حرکتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام امت ان سے ناراض ہو جائے اور جیسے ایک حکومت کا تختہ الٹا تھا ان کا بھی الٹ دیتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اموی خلافت بھی سو برس تک ایسی مقبول رہی کہ ان کے مقابلے میں کوئی ہنگامہ کارگر نہ ہو سکا۔ اور عباسی خلافت بھی زائد از پانچ سو برس بغداد میں اس شان سے قائم رہی کہ جو بھی اس کے خلاف کھڑا ہوا، اس نے منہ کی کھائی۔ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ اموی خلافت مشرق میں ختم ہوئی تو مغرب میں قائم ہو گئی۔ اول امارت کی حیثیت سے پھر خلافت کی صورت میں۔ اسی طرح خلافت بنو عباسیہ بغداد ختم ہوئی تو مصر میں دوبارہ عباسی خلافت ہی کا احیاء کیا گیا۔ برخلاف اس کے جو افراد ان خلافتوں کے خلاف کھڑے ہوئے ان کے سب عزائم خاک میں مل گئے۔ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں وضعی مناقب و فضائل اور مظلومیت کی داستانیں کب قابل اعتناء رہتی ہیں۔ اور کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت میں اموی اور عباسی خلافتوں کو قبولیت عام حاصل نہ تھی اور لوگ دیوانہ وار ان ہستیوں پر فدا تھے جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہو کر ناکام رہے۔

علوی سادات

امیر المومنین المامون کے زمانے میں عباسیوں کی مردم شماری کی گئی تو چھوٹوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کی تعداد تیس ہزار تین تھی (صحی الاسلام، ج ۱، ص ۱۲۶) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی ہاشمیوں اور مطلبیوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ بعد کی صدیوں میں جو اضافہ ہوا وہ اپنی جگہ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اموی اور عباسی خلافتوں میں ڈھائی سو برس کے اندر حسنیوں اور حسینیوں کے خروجوں کی تعداد ۶۵ کے قریب ہے (ملاحظہ ہو تحقیق مزید بسلسلہ

خلافت معاویہؓ و یزیدؓ) ان میں سے کسی کو اتنے حمایتی میسر نہ آسکے کہ معمولی چپقلش سے زیادہ امت کو کچھ نقصان پہنچا سکیں۔ پھر ان میں ایک بھی خروج ایسا نہ تھا جس میں کھڑے ہونے والے کو بھی اس کے اپنے گھرانے کے لوگوں نے غلط اقدام سے نہ روکا ہو۔ اور اس کا ساتھ دینے سے گریز نہ کیا ہو۔

لہذا یہ سمجھنے کی گنجائش نہیں کہ امویوں اور ہاشمیوں میں یا عباسیوں اور علویوں میں کوئی خاندانی چپقلش تھی۔ یہ سب آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے باہمی رشتے پیہم و متواتر ہوتے رہے اور آج تک ہوتے ہیں۔ سیاسی خلفشار جو گنے چنے لوگوں نے پیدا کیا، اس کا کوئی اثر ہاشمیوں و امویوں کے اپنی مودت اور تعلقات خویشی پر نہیں پڑنے دیا۔ لیکن ہوا پرست لوگوں نے ان ہزاروں علوی سادات کو فراموش کر کے بعض افراد کے شخصی اقدامات کو خاندانی اور نسلی نزاع کی صورت دے دی۔ بلکہ انھیں دینی رنگ دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ نہ سوچا کہ امویوں و امویوں میں، عباسیوں و عباسیوں میں، حسینیوں اور حسینیوں میں، حسینیوں و حسینیوں میں بھی سیاسی بنا پر خوں ریزی ہوئی۔ جب ان واقعات کو خاندانی یا دینی نہیں بنایا گیا اور افراد تک محدود رکھا گیا تو ان ۶۵ خروجوں کو یہ اہمیت کیوں دی جائے۔ جو دے دی گئی ہے اور امت میں مستقل افتراق کا سبب بنادیا گیا ہے۔ جب خود امویوں، عباسیوں اور علویوں نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور باہمی مودت و قرابت کے تعلقات کی خوشگواہی قائم رکھی، تو بعد کے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ پرانی باتوں کو ہوا دیتے رہیں اور گڑھے مردے اکھاڑیں۔

امت کے سواد اعظم کا ہمیشہ یہ دتیرہ رہا اور یہی سنت صحابہ کرام کی ہے کہ اگر وقتی اختلاف پیدا ہو حتیٰ کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچ جائے تو وقت گزر جانے پر اختلاف نے سب کچھ بھلا دیا اور وحدت امت قائم رکھی، اسی کے نتیجے میں ارتقاء ہوا اور دنیا میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ان لوگوں کو ڈیڑھ ہزار برس کے اس تجربے کے باوجود یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ گزرے ہوئے حوادث کا ہیجان انگیز تذکرہ تعمیری نہیں ہے تخریبی ہے۔ اخلاف کے قلوب اسلاف کی طرف سے مکدر ہوتے ہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی ہستیاں زیر تنقید آتی ہیں۔ منہ میں زبان اور ہاتھ

میں قلم کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں اور غلط بات کی تیغ تو اہل فکر کو کرنی ہی پڑتی ہے۔

علویوں کے ۶۵ خروج اور ملت اسلامیہ کے چھیا سٹوئیں غداری، شریف حسین کی، ایسی حرکتیں نہیں ہیں کہ امت مسلمہ کو ان لوگوں سے کوئی ہمدردی ہوتی اور وہ انھیں خلافت پر فائز کرنے کے لیے کسی درجے میں تیار ہو سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں کو کبھی کامیابی نہ ہو سکی اور ان افراد کی حرکتوں کا نتیجہ سوائے فتنہ و فساد کے اور کچھ نہ نکلا۔ یہ فساد اگر معمولی سیاسی چپقلش کی طرح کے ہوتے تب بھی ایک بات تھی مگر انھوں نے تو آپس میں بہیمانہ اور شرمناک بلکہ ناپاک حرکتیں کیں کہ قلوب ان کی طرف سے پٹے چلے گئے۔ مثلاً:

۱۔ حسین بن الافطس بن الحسن بن علی بن الحسینؑ: ان صاحب نے امیر المومنین المامون کے عہد میں خروج کیا۔ کعبہ کے ستونوں پر جتنا سونا چڑھا ہوا تھا وہ کھرچ لیا اور کعبے کے خزانوں میں جتنی نفیس اشیاء تھیں انھیں لوٹ لیا۔ لوگوں کا مال و متاع تھپیانے کے علاوہ ان پر ایسے ایسے مظالم کیے کہ اکثر لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بیان عمدۃ الطالب کے شیعہ مورخ و نساب کا ہے۔

۲۔ محمد بن جعفر الصادقؑ: اپنے صادق باپ کا یہ کاذب بیٹا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ ابن الافطس نے جب دیکھا کہ اس کی حرکتوں سے لوگ انتہائی متفر ہو گئے ہیں تو محمد (بن جعفر) کو ورغلا کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

”بعد چندے محمد بن جعفر (الصادق) کے لڑکے علی اور حسین ابن الافطس نے ہاتھ پاؤں نکالے اور طرح طرح کی بد اعمالیاں کرنے لگے۔ زنا، اغلام اور سر بازار عورتوں کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو گئی اور انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ پھر جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکا نظر آتا۔ اس پر یہ ٹوٹ پڑتے حتیٰ کہ قاضی مکہ کے لڑکے کو بھی نہ چھوڑا۔“

امیر المومنین المامون نے سرکوبی کے لیے لشکر بھیجا تب اس فتنے سے نجات ملی۔ اب

یہ امیر المومنین کا غوث تھا کہ چونکہ محمد بن جعفر نے توبہ کی اور حدیثیں وضع کرنے پر شرمندگی ظاہر کی تو اسے معاف کر دیا۔

۳۔ زید النار بن موسیٰ (الکافم): چند دن کے لیے اس شخص نے بصرے میں شورش پیا کی۔ عباسیوں کے گھر جلا دیے۔ لوگوں کا مال و متاع لوٹا، باغیوں کو آگ لگا دی۔ اس لیے زید النار کہلایا۔ جب گرفتار ہو کر امیر المومنین المامون کے حضور پیش ہوا تو آپ نے اپنے رحم و کرم کے سبب اسے معاف کر کے اس کے بھائی اور اپنے داماد امیر علی الرضا کے پاس بھیج دیا۔ مگر وہ اس کی حرکتوں سے اتنے ناراض تھے کہ مدت العمر اس سے بات نہیں کی۔ (عمدة الطالب، ص ۲۱۰)

۴۔ ابراہیم الجزار بن موسیٰ (الکافم): اس شخص نے یمن میں فساد کیا اور اتنے لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا کہ اس کا نام 'الجزائر' پڑ گیا یعنی قصاب گرفتار ہونے پر امیر المومنین المامون نے اسے بھی معاف کر دیا۔

۵۔ اسماعیل بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبد اللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب: اس شخص نے امیر المومنین المستعین باللہ کے زمانے میں مکہ معظمہ کو آماجگاہ فساد بنایا۔ البدایہ والنہایہ میں ہے: (ج ۱۱، ص ۹) نیز طبری میں ہے:

واخذ مافی الکعبۃ من الذهب والفضتہ والطیب وکسوة الکعبۃ.

[کعبے میں جتنا سونا، چاندی، عطر اور پردے غلاف تھے وہ سب نے لوٹ لیے۔]

پھر بقول طبری (ج ۱۱، ص ۱۳۷، نیز البدایہ والنہایہ، ج ۱۱، ص ۱۰)

واعترض الججاج فقتل منهم جمعاً کثیر ونهبهم (حاجیوں کے قافلے پر ٹوٹ پڑا۔ بہت سے لوگوں کو شہید کیا۔ اور ان کا مال لوٹ لیا) پھر یہی حرکتیں اس نے مدینے میں کیں۔

وهو الذی حاصر المدینۃ حتی مات اهلها جوعاً ولم یصل احد فی

مسجد رسول اللہ ﷺ

اس شخص نے مدینے کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وہاں کے لوگ بھوکوں مر گئے

اور مسجد نبوی میں کوئی شخص نماز نہ پڑھ سکا۔]

۷۔ محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابی طالب:
 ۲۵۶ھ میں اس شخص نے امیر المومنین المعتمد علی اللہ کے زمانے میں خروج کیا۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر
 علانیہ شراب پیتا تھا اور بدفعلیاں کرتا تھا۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں: (جمہرۃ الانساب، ص ۳۴)
 وكان من افسق الناس شرب الخمر في مسجد النبي ﷺ نهاراً و
 فسق فيه ببقينه لبعض رحمه الله وقتل لبعض اهل المدينة بالسيف
 والجوع وكان قيامه ايام المعتمد وقتل اهل المدينة ولم يصل بها
 طول مدته فيها جمعة وجماعته۔

[یہ نہایت درجہ فاسق تھا۔ مسجد نبوی میں علانیہ شراب پیتا تھا اور بعض اہل مدینہ کی
 چھوڑیوں کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا۔..... اس نے اہل مدینہ کو تلواریں اور بھوک سے
 مارا اس نے خلیفہ المعتمد علی اللہ کے زمانے میں بغاوت کی تھی۔ اہل مدینہ کو اسی
 نے قتل کیا کہ جب تک اس کا تسلط رہا (مسجد نبوی میں) جمعے کی نماز ادا نہ کی جاسکی۔
 اور نہ جماعت کی]

۷۔ محمد بن الحسین بن جعفر بن موسیٰ (الکاظم): اس نے اور اس کے بھائی علی بن
 الحسین نے مدینے میں بغاوت کی۔ ۲۷۱ھ کا واقعہ ہے۔ امیر المومنین المعتمد علی اللہ کا عہد تھا۔
 اس بغاوت کے احوال امام ابن حزم اس طرح بیان کرتے ہیں: (جمہرۃ الانساب، ص ۵۸)

وهما الذان قاما في ۲۷۱ هـ بالمدينة فقتلا اهلها واخذوا اموالهم
 واخربا المدينة حتى لا يصلوا في مسجد رسول الله ﷺ
 شهراً كاملاً لا جمعة وجماعة اصلاً. وقتل محمد بن الحسين حين
 قيام ثلاثه عشر رجلاً من ولد جعفر بن ابي طالب رضى الله عنه
 عند صبروا وهو ملقب بالمليط.

[ان دونوں نے مدینے میں ۲۷۱ھ میں بغاوت کی۔ وہاں کے لوگوں کو قتل کیا اور

ان کا مال لوٹا مدینے کو ایسا تباہ کیا کہ مسجد نبوی میں پورے ایک مہینے نہ جمعہ ہوسکا اور نہ جماعت کی قطعاً کوئی نماز ہو سکی اور اس محمد بن الحسین نے اپنے تسلط کے دوران حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد میں سے تیرہ حضرات کو پکڑ کر شہید کر دیا۔ اس لیے اس کا لقب ملیط ہو گیا۔ (یعنی خبیث بے ننگ و نام)

ان نام نہاد ”سادات کرام انباء رسول اللہ“ کی حرکتوں کے یہ چند نمونے ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے قلوب ان سے کیوں متنفر رہے۔ اور کس وجہ سے آل علی کی خلافت قائم ہونے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس قسم کی حرکتیں صرف انھی سات آٹھ آدمیوں کی نہ تھیں، ان ۶۵ میں سے اکثر کا کردار ایسا ہی پست اور شرمناک تھا، تفصیل طویل ہے اور موجب ندامت۔

اب اموی اور عباسی خلافتوں پر تنقید کرنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تمام جرائم جن کا صدور بعض آل علی سے ہوا، ان کا ذکر نہیں کرتے اور انھی جرائم کو کذباً و افتراء اموی اور عباسی خلفاء پر تھوپ دیتے ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ اگر خلفائے کرام نے ایسی حرکتیں کی ہوتیں اور ان بعض علویوں نے اپنی پاک بازی اور عدل کوشی کی کوئی مثال قائم کی ہوتی یا امت نے ان کی کاروائیوں کو کسی درجے میں تعمیر سمجھا ہوتا تو امویوں اور عباسیوں سے ان کے دل بھر جاتے اور ان علویوں کی طرف قلوب مائل ہوتے۔ انھیں کامیاب کرنے کے لیے مسلمان جوق در جوق جان و مال کی بازی لگانے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ یعنی عالم یہ نہ ہوتا کہ ان میں سے کوئی ایک خروج بھی ایک ناکام وقتی ہنگامے سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ اور امت کے قلوب خلافت قائمہ ہی کی طرف جھکے رہے۔

ابن علقمی اور اس کے سہابی ساتھیوں نے آل علی کی خلافت قائم کرنے کے لیے ہلاکو خان سے ساز باز کی اور مرکز خلافت تباہ کر دیا۔ مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ امت پر بلا نازل ہوئی۔ ان کی بستیاں اجڑ گئیں، لیکن آل علی کی خلافت قائم ہونے کے بجائے مصر میں پھر خلافت عباسیہ ہی قائم ہو گئی۔ مسلمانوں نے بعد میں ان تاتاریوں کا وہ قلع قمع کیا کہ سب بدلہ

لے لیا گیا۔ یعنی یہ لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی اخلاقی برتری سے ایسے متاثر ہوئے کہ گروہ گروہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ یوں عالم اسلام میں دعوت محمدیہ کی نشاۃ ثانیہ کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کر دیا۔

پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

ہمارے زمانے میں اسی علوی خلافت قائم کرنے کی ہوس میں شریف حسین نے نصاریٰ سے ساز باز کی۔ اسلحہ اور اشرافیوں کے صندوق کے صندوق وصول کر کے بغاوت کی پوری پوری تیاری کی۔ اور عین اس وقت جب ترکی خلافت کے امیر المومنین نے کفار کے خلاف اعلان جہاد کیا، اس شخص نے کفار کے ساتھ ہو کر امیر المومنین کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ترکی امیر عساکر کو جب اس کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی اور انھوں نے اس سے باز پرس کی تو اس شخص نے خاص حرم میں کعبہ کے قریب کھڑے ہو کر حلفیہ بیان دیا کہ انواہیں غلط ہیں اور میں پوری طرح عہد وفاداری پر قائم ہوں، وہ صاحب ایمان شخص تھے مطمئن ہو گئے لیکن شریف حسین اور اس کے لوگوں نے جو حرکتیں کیں، جس طرح خاص حرم میں ترکوں اور مخلص مسلمانوں کو شہید کیا، ان دلدوز واقعات کے عینی شاہد شاید اب بھی موجود ہوں۔ مولانا خلیل احمد انصاری نے بذل الجہود فی حل ابی داود میں ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے یہ سب تفصیلات عینی شاہدوں سے معلوم کر کے بیان کی ہیں جو حرم کے علماء و فقہاء میں ہیں۔ (کتاب الفتن والملاحم، ج ۵، ص ۸۹) اس شخص نے محض امت کا کلمہ ہی متفرق نہیں کیا اور امام المسلمین کے خلاف بغاوت ہی نہیں کی محض حرم میں بے گناہ مسلمانوں کو شہید ہی نہیں کیا۔ بلکہ اپنے نصرانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے بعض ترک خواتین کی وہ بے حرمتی کرائی جس کے بیان کو قلم کا سیدنہ شوق ہوتا ہے۔

اسی کے نتیجے میں عالم اسلام پر وہ مصائب ٹوٹے کہ بظاہر ابھی فلاح کا وقت دور نظر آتا ہے۔ عرب کے ٹکڑے ہو گئے۔ فلسطین پر یہود قابض ہیں اور تمام عرب بلاد عربیہ و اسلامیہ کفار کی ترک و تاز سے نیم جان ہیں۔ لیکن اللہ کا وعدہ ہے۔ اس دور ابتلاء سے مسلمان پھرا بھریں گے جس کے کچھ آثار پیدا بھی ہو رہے ہیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

اندلس کی اموی امارت و خلافت

امیر عبدالرحمن اموی الداخل نے اگرچہ خلیفہ عباسی سے بیعت نہیں کی تھی۔ لیکن خلیفہ اسلام انہی کو جانتے تھے جیسا کہ خود فرمایا ہے اور اوپر مذکور ہوا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ عباسی خلافت اور اموی امارت میں انتہائی چشمک اور عدوات ہوتی لیکن امیر المومنین المنصور نے ابتدائی ناکامی کے بعد اندلس فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور یوں بے تعلقی کی فضا قائم ہو گئی لیکن بے تعلقی سیاسی تھی، دینی اور خاندانی تعلقات بدستور قائم رہے۔ دونوں مملکتوں کے شہری اطمینان سے آتے جاتے تھے جس طرح اموی سادات کو خلافت عباسیہ میں اہم مناصب دیے گئے اور انھیں خاص مراعات سے نوازا گیا۔ اسی طرح بعض عباسی سادات کا قیام اموی امارت اندلس میں ثابت ہے۔ امام ابن حزم نے متعدد عباسیوں کا اندلس میں حکومت کے مہمانوں کی حیثیت سے رہنا بیان کیا ہے۔ پھر تحصیل علم یا سیر و سیاحت کے لیے اندلس کے مسلمانوں کا بلاد عربیہ میں آنا جانا جاری رہا۔ اندلس کے ایک عظیم عالم حضرت امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی جو موطأ کے راوی ہیں وہی اس کو اندلس لے گئے تھے اور وہاں وہ خود عظیم کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ علاوہ ازیں ملّی وحدت اور دینی اخوت خود موطأ کی تدوین سے ثابت ہے اور اندلس میں اس کی وہی حیثیت ہوئی جو خلافت عباسیہ میں تھی۔ ہمارے بیان پر شاید عادل ہے۔ اموی حکمرانوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس کی تدوین عباسی امام نے کرائی ہے، علم کے بارے میں سیاسی یا نسلی یا لسانی کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا اور نہ مسلمانوں کے ہاں علم کی اجارہ داری کسی خاص خاندان میں تسلیم کی گئی بلکہ اسے انھوں نے روح اسلامی کے خلاف جانا۔

چنانچہ موطأ کی تالیف میں اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ روایت فلاں خاندان کے افراد کی ہے۔ اسے نہ لیا جائے یا اس کے راوی کا فلاں سیاسی موقف تھا۔ اس لیے اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔

وہاں صرف راوی کی عدالت اور اس کا علمی مقام دیکھا جاتا تھا چنانچہ اس میں جہاں

ہاشمی سادات کی مرویات اور فتاویٰ ہیں وہاں اموی سادات کی مرویات و فتاویٰ کو بھی وہی حیثیت دی گئی ہے۔ جمل و صفین میں حصّہ لینے والے یا غیر جانب رہنے والے یا بعد کے سیاسی نزاعات میں فریق بننے والے سب سے اس کتاب میں یکساں استفادہ کیا گیا ہے۔ عباسی ائمہ نے امام مالک سے جب اس کی سماعت کی تو حضرت امیر المومنین معاویہؓ، امیر المومنین مروان اور امیر المومنین کی وہی علمی اور روحانی عظمت تسلیم کی جو حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تھی بلکہ عبداللہ بن الزبیرؓ کی بھی جن کی سیاسی چپقلش امویوں اور ہاشمیوں دونوں سے رہی، اسی طرح اندلس کی اموی امارت اور پھر خلافت میں ہاشمی سادات اور ابن الزبیرؓ اور دوسرے وہ حضرات جو سیاسیات میں غیر جانب دار رہے۔ ان سب کی یکساں حیثیت تسلیم کی گئی۔ اور سب کے ارشادات قانونی نظائر کی حیثیت سے سنے اور سمجھے جاتے رہے۔ وہاں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ ”ہم صرف اپنے سلسلہ امامت پر انحصار کرتے ہیں اور بس۔“

اب ایک اور دلچسپ واقعے کی تفصیل ملاحظہ ہو جس سے اندازہ ہوگا کہ دینی اور ملیّی معلومات میں عباسی خلافت اور اموی امارت میں ہمیشہ یگانگت اور باہمی اعانت کا تصور قائم رہا۔ مثلاً امیر المومنین المامون کے زمانے میں اندلس کے امیر عبدالرحمن الثانی تھے۔ اس زمانے میں مصر کے والی امیر زیادۃ اللہ نے صقلیہ (سسیلی) پر دھاوا بول رکھا تھا۔ قاضی اسد بن فرات کئی شہر فتح کرنے کے بعد شہید ہو چکے تھے، پھر محمد بن الجواری نے قیادت سنبھال لی اور وہ بھی متعدد فتوحات کے بعد ۲۱۴ھ میں وفات پا چکے تھے۔ اب امیر عسکر زہیر بن غوث تھے انھوں نے متعدد فتوحات کے بعد شکست کھائی اور اسلامی لشکر محصور ہو گیا۔ اتنے میں رومیوں کی طرف سے ایک بڑی امدادی فوج بھی آ گئی۔ جس سے مجاہدوں میں ہر اس پھیل گیا اسی عالم میں اچانک اندلسی بحری بیڑا ادھر سے گزرا جس میں تین سو جہاز اور بیس ہزار سپاہی تھے، اس بحری لشکر کے افسر فرغوش تھے انھوں نے جو صورت حال دیکھی تو وہیں رک گئے اور مسلم فوج کا ساتھ دیا۔ ادھر امیر زیادۃ اللہ کی طرف سے بھی مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی، اب اسلامی لشکر کافی طاقتور ہو گیا۔ فوج کی جدید ترتیب دی گئی اور سب نے بالاتفاق اس کی کمان امیر فرغوش اندلس کے سپرد کر دی۔ لیکن

پھر مسلمان شکست کھا گئے یہ صورت دیکھ کر امیر فرغوش وہاں سے ہٹ گئے اور بلرم پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا جب تک کہ فتح یاب ہوئے اور یوں پالا لشکر اسلام کے ہاتھ رہا۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد امیر فرغوش کا بیڑا اپنے بھائیوں سے رخصت ہو گیا۔ انھوں نے یہ نہیں چاہا کہ اس فتح کے ثمرات میں حصہ بنائیں۔ عباسی لشکر کی یہ امداد محض فی سبیل اللہ کی گئی تھی اور صرف دینی اور ملی جذبہ کا فرما تھا (ملاحظہ ہو نصیر احمد جامعی کی کتاب مسلمان سسلی میں، ص ۴۸-۴۹، طبع سنگ میل پبلیکیشنز لاہور)

اب ملاحظہ ہو یورپ کے مورخوں کا یہ افتراء محض کہ اندلس کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لیے امیر المومنین ہارون الرشید نے شاہ فرانس شارلمین سے تعلقات قائم کیے تھے اور اس درجہ کی اس استمالت انھیں منظور تھی کہ القدس کے کلیسا کی کنجیاں اسے بھجوا دیں۔ دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اندلس کی اموی امارت نے بازنطینی حکمران سے اپنے تعلقات استوار کیے تاکہ عباسی خلافت کو پریشان کرتا رہے، یورپ کے مورخوں کی اس ہرزہ سرائی کا کوئی سراغ ہمیں قدیم مسلم مورخوں کے ہاں نہیں ملتا حالانکہ اگر اس منظر کشی میں صداقت کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کا ذکر ضرور کرتے دراصل یہ نصرانی مورخوں کے احساس کمتری کی ایک علامت ہے ان کے سامنے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کا تمدنی، تہذیبی، معاشرتی اور علمی تفوق تھا اور اقوام عالم میں ان کی سیاسی برتری تھی۔ ان کے مقابلے میں یورپ کی ذہنی، روحانی، علمی، معاشرتی اور سیاسی پستی تھی۔ اس لیے انھوں نے عباسیوں اور امویوں کے مابین چپقلش بیان کر کے اپنے عوام کو تسلی دینے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے بادشاہ ایسے عظیم المرتبت تھے کہ مسلم حکمرانوں کو اپنے معاملات میں ان کی امداد کی احتیاج رہتی ہے۔ یعنی کافروں کی مدد سے وہ ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

اب ایک طرف دیکھا جائے وہ واقعہ جو اوپر بیان ہوا۔ اور دوسری طرف یورپ کے مورخوں کی یہ افتراء پردازی، ان دونوں میں کوئی وجہ تعلق نظر آتی ہے؟ اموی سادات کرام کی عظمت و شرف اور ان کی للہیت دینی غیرت اور امور ملیہ میں تقویٰ شعاری کی ہم ایک اور مثال دینا چاہتے ہیں جب عباسی خلافت رو بہ نخطاط ہوئی۔ ایک طرف مشرق میں مجوسی الاصل بویہی

خاندان امور خلافت پر مستولی ہو گیا اور دوسری طرف مغرب میں دوسرا مجوسی الاصل عبیدی خاندان، اور یوں خلیفہ عباسی کی حیثیت ایسی نہیں رہی کہ وہ آزاد فرائض امامت انجام دے سکیں تو اموی امیر عبدالرحمن الناصر نے علماء و فقہاء کا ایک اجلاس طلب کیا کہ خلیفہ اسلام کی عجز کے سبب کیا اس کا امکان ہے کہ میں اپنے آپ کو خلیفہ کہہ سکوں۔ کیونکہ وہ اب اپنے فرائض صحیح ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان عبیدی ملاحدہ کی حکومت اور پھر سمندر حائل ہے۔ تو اس وقت علماء نے فتویٰ دیا کہ ایسی صورت میں دو خلافتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ تب امیر عبدالرحمن الناصر نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اور امیر المومنین کہلائے اموی ذہنیت یہ نہیں تھی کہ جب چاہا اور جہاں چاہا چند آدمی جمع کیے اور خلافت کا اعلان کر دیا پھر چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اموی حضرات ہر معاملے میں قواعد شرعیہ اور مفاد مملکت پیش نظر رکھتے تھے۔ ویسے ہر خاندان میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حالات کبھی سازگار ہوتے ہیں اور کبھی نہیں سیاسی مدد جزر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ امیر المومنین الناصر نے عباسی خلیفہ کی آئینی حیثیت کا انکار کر کے اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ان کو خلیفہ اسلام تسلیم کر کے ایک شرعی جواز تلاش کیا کہ ایسے احوال میں دو خلافتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر دین کے بجائے خاندانی عصبیت کا جذبہ ہوتا تو خلیفہ عباسی کی خلافت کا انکار کر کے اپنی خلافت قائم کرتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسا اقدام ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری ہوتا اور اس سے امت کا کلمہ متفرق ہو جاتا۔

برخلاف اس کے آل علی میں سے جتنے لوگوں نے اموی اور عباسی دور میں خروج اور بغاوتیں کیں وہ چونکہ تعمیری نہ تھیں اور نہ ان کا کوئی ملّی نصب العین تھا، اس لیے امت میں انھیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ شخصی طالع آزمائی کے علاوہ ان کا کوئی مٹّٰح نظر نہ تھا۔ پھر امت اس گروہ سے بھی نالاں تھی۔ جنھوں نے وقت بے وقت بلکہ ہمیشہ بے وقت ان علویوں کو ابھار کر میدان میں کھڑا کیا۔ اور پھر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔

وجہ یہ بھی ہے کہ اموی خلافت خالص عربی حکومت تھی اور عرب اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اپنی حاکمیت ختم کر دیں۔ اس لیے اموی دور میں علویوں کو ناکامی ہوئی۔ دعوت عباسیہ میں

تمام مسلمانوں کی حاکمیت کا تصور تھا اور ہر اسلامی ملک کو حکومت چلانے کی دعوت تھی۔ اگر علویوں کا تصور بھی ایسا ہی ہوتا تو شاید وہ کامیاب ہو جاتے مگر ان کے ہاں تو مدار اس پر تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی ذریت ہیں۔ اس لیے تمام امت کو ہماری حاکمیت تسلیم کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی کھڑا ہوا اس نے اپنے ”ابن رسول اللہ“ ہونے ہی پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھی، آسمان وزمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ایک ہی خلیفہ کے خلاف کئی کئی ”ابنائے رسول اللہ“ کھڑے ہو گئے۔ مگر ان میں نہ باہم کوئی رابطہ تھا نہ حکومت قائمہ کا تختہ الٹنے کا سامان، اور نہ انقلاب کے بعد کوئی نصب العین جسے موقع ملا اس نے سودو سودو اور دہن رائجی لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور اس بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا، اور وہ بھی اپنے ہی خاندان کے دوسرے مدعیوں کے خلاف حریفانہ اگر کھڑے ہوتے تو کم از کم وقتی طور پر تو متحد رہتے۔

تاریخ کا طالب علم جب ان لوگوں کے ”کارنامے“ دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ وہ تعمیر اور ارتقاء امت اور اہل عالم کے لیے دائمی عدل عمرانی کی دعوت جو رسول اللہ ﷺ نے جاری کی اور جس کے لیے آپ کے اصحاب کرامؓ نے جان و مال کی بازی لگائی پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی ہجری میں شریف حسین کی بغاوت کو ایک ہی منظر سامنے آتا ہے ایسے باغیوں کی امداد و حمایت کا اتہام امام اعظم ابوحنیفہؒ پر عائد کیا گیا۔ جس کی حقیقت پچھلے اوراق میں کھول دی گئی ہے۔ اب یہ امت مرحومہ پر اللہ کا فضل ہے اس کے وعدوں کی حقانیت ہے رسول خدا ﷺ کی معجزانہ برکت ہے اور صحابہ کرامؓ کی کرامت ہے کہ نام نہاد ”ابنائے رسول اللہ“ کی لائی ہوئی ہر مصیبت یہ امت جھیل گئی۔ اور رہ کر اپنی ہستی اپنی دعوت اور اپنے عزائم بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے تائید ایزدی سے اپنی نشاۃ جدیدہ کا انتظام کرتی رہی اور اب بھی یہی توقع ہے کہ پھر اس امت کو اقوام عالم میں وہی مقام حاصل ہوگا جو فطری طور پر اس کا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ۚ بَعْدُ ط وَيَوْمَئِذٍ يُفْرِخُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَنْصُرِ اللّٰهُ ط (الروم: ۴-۵)

حوالہ جات

۱۔ کاشانہ خلافت کی حفاظت کرنے والوں میں عبداللہ بن عباسؓ، محمد بن طلحہؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، مروان بن الحکمؓ، حسن بن علیؓ جیسے حضرات تھے۔ چھت پر پہرہ دینے والوں میں ابو ہریرہؓ جیسے بزرگوار تھے۔ ام المومنین ام حبیبہ صلوٰۃ اللہ علیہا جب باغیوں کو سمجھانے اور مشکیزہ آب پہنچانے تشریف لائیں تو اشتر نخعی نے آپ کے خچر کے منہ پر گھونسا مار کر اس کا رخ پھیر دیا، امیر المومنین کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے ابن عباسؓ کو حکم دیا کہ ازواج مطہرات کو لے کر فوراً مکے چلے جائیں انھوں نے عرض کیا کہ میرے نزدیک حج سے زیادہ ضروری ان باغیوں کے خلاف جہاد معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ نے سرکاری طور پر انھیں امیر حج بنا کر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی ایک کتبہ دیا کہ حاجیوں کو سنا دیں تاکہ مدینے کی صورت حال انھیں معلوم ہو جائے۔ محافظوں کی طرف سے بار بار عرض کیا جاتا تھا کہ قتال کی اجازت مل جائے مگر اس پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے حتیٰ کہ آخر میں سب سے اپنا گھر خالی کر لیا۔ ابن الزبیرؓ سب کے بعد نکلے تھے کیونکہ حضرت ابن الزبیرؓ کو امیر المومنین نے اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ مکان تو خالی ہو گیا مگر محافظ دروازے پر برابر موجود رہے۔ امیر المومنین شہادت کے لیے پوری طرح تیار ہو کر تلاوت کلام پاک میں مشغول تھے کہ برابر کے ایک خالی گھر میں سے چڑھ کر چند باغی اندر آ گئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آسمان راقع بود گر خوں بہادر بر زمین۔ آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ نائلہؓ نے جب دیکھا تو آپ کے اوپر جھک گئیں لیکن آپ کی انگلیاں کٹ گئیں اور آپ کو دھکیل کر قاتل اپنا کام کر گئے۔ محمد بن ابی بکر، عمر دین الحق اور کنانہ بن بشر اس ٹولی میں تھے۔

۲۔ یہ مواقف تو صحابہ کرام کے بیان ہوئے ان کے علاوہ بھی تابعین کی بڑی جماعت تھی جنھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی تھی اور آئینی حیثیت سے انھیں امام جانتے تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف انھیں لڑنا گوارا نہ تھا، اول تو ان کی شخصی عظمت اور خدمات ملیہ تھیں۔ پھر جو مطالبہ لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے اس کی حقانیت دلوں میں ایسی گہر گئی تھی کہ ان کے خلاف نبرد آزما ہونے پر ان کے قلوب مائل نہ ہو سکے۔ حالانکہ یہ لوگ ہمدانی تھے جنھیں حضرت علیؓ سے خاص عقیدت تھی۔ اپنی رعایا کی اس نفسیاتی کیفیت کا ادراک خود بھی آپ کو تھا،

اسی لیے جو لوگ صفین کی جنگ میں شرکت پر تیار نہ تھے انھیں آپ نے دوسرے علاقوں میں جہاد کے لیے بھیج دیا تاکہ آپ کی فوج کی صفوں میں انتشار نہ پھیلے چنانچہ فتوح البلدان میں ہے: (فتوح البلدان، ج ۱، ص ۴۵۸، ترجمہ)

”مرۃ ہمدانی کہتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؑ نے ہم سے فرمایا: تم میں سے جو شخص ہمارے ساتھ ہو کر معاویہؓ سے قتال پسند نہ کرے وہ اپنی عطاء لے لے اور دینامیوں کی طرف جا کر ان سے جنگ کرے۔ راوی کہتے ہیں میں انھی میں تھا جنھوں نے دوسری صورت پسند کی۔ ہم نے عطائیں لیں اور دینام کی جانب روانہ ہوئے ہماری تعداد پانچ ہزار تھی۔“

۲ اس گروہ کی حرکتیں اہل صفاء کو ناگوار تھیں، چنانچہ حضرت ابویوب انصاریؓ جنگ جمل تک حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، پھر الگ ہو گئے اور صفین میں شریک نہیں ہوئے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ بذیل عنوان خالد بن زید) حضرت جریر بن عبداللہؓ جنگ جمل کے بعد تک ساتھ رہے لیکن پھر بدول ہو کر مدینہ چلے گئے۔ حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ صفین کے بعد تک ساتھ رہے اور مصر کے والی بنے لیکن سبائیہ کی ریشہ دوانیوں سے ناراض ہو کر الگ ہو گئے اور مدینہ جا بیٹھے۔

۳ شیعہ امامیہ کے مجتہد اعظم شیخ مقید نے اپنی مشہور کتاب من لا یخضرہ الفقہ کے باب الاذان میں صراحتاً بیان کیا ہے کہ مقوضہ ہی ہیں جواز ان میں حضرت علیؓ کے ولی اللہ اور وحی رسول اللہ اور خلیفہ بلا فصل ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ جزو اذان نہیں ہیں جو ان الفاظ کو جزو اذان سمجھ کر اس کو اذان دیتے وقت کہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

۵ غیر شیعہ جہا بھی شیعہ پروپیگنڈے سے یہ نعرہ لگا بیٹھتے ہیں۔

۶ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کام تو بہت کیا مگر تاریخی اعتبار سے سطحی اور اغاٹ سے پُر۔ حضرت ابن عباسؓ کے احوال میں کہا گیا ہے کہ صفین کے معرکوں میں وہ بڑی بہادری سے لڑے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ جمل میں ام المؤمنین صلوٰۃ اللہ علیہا کے خلاف معرکہ آرا ہوئے اور نہ صفین میں۔ وہ بصرے کے والی تھے اور شروع سے آخر تک رہے۔ میدان جنگ میں ان کے آنے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔ اسی طرح آل عباس میں سے کسی کا حقیقی جنگ میں شریک ہونا ثابت نہیں کیونکہ وہ سب مختلف علاقوں کی حکومت پر فائز تھے۔ البتہ یہ ہے کہ جنگ جمل میں

جب باہمی صلح ہو گئی تو حضرت علیؑ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ نے بطور ضامن کے اصحاب جمل کے ہاں رات گزاری اور حضرت محمد طلحہؓ نے اصحاب جمل کی طرف سے لشکر مرتضوی میں (منہاج السنہ، البدایہ والنہایہ نیز طبری) اسی طرح صفین کے بعد تالشوں کا فیصلہ سننے کے لیے جو اجتماع ہوا تھا اس میں حضرت علیؑ کی طرف سے چار سو نمایندوں کی قیادت حضرت ابن عباسؓ نے کی اور آپ ہی انھیں نماز پڑھاتے تھے پھر حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین صلح نامہ مرتب کرنے میں آپ نے شرکت کی، غرض ان جنگوں میں تعمیری موقف حضرت ابن عباسؓ ہی کا نظر آتا ہے اور آپ مسلمانوں کے مابین کشت و خون پسند نہیں کرتے تھے اور یہی موقف حضرت حسنؓ کا تھا، نیز حضرت محمد بن طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بن العاص کا۔



اختلاف مذاہب

امیر المؤمنین المامون کے عہد مبارک میں ایک نصرانی شخص نے اسلام قبول کیا۔ اور کچھ دن بعد مرتد ہو گیا۔ امیر المؤمنین نے اسے اپنے ہاں طلب کر کے پوچھا کہ: اسلام سے تمہیں وحشت کس سبب سے ہوئی؟ اس نے کہا: آپ کے دین میں مجھے اختلاف کی کثرت نظر آئی۔ آپ نے فرمایا: ہمارے ہاں اختلاف دو قسم کا ہے ایک تو ایسا جیسے اذان کا ہے، جنازے کی تکبیر کا ہے، پھر تشہد کے اختلافات ہیں، عیدین کی نمازوں کے ہیں، ایام تشریق کے تکبیروں کے ہیں، قرأتوں کے ہیں، اور فتوے دینے کی دلیلوں کے ہیں اور ایسے ہی اور اختلافات ہیں۔ تو ان کو اختلاف نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اختیار ہے تو سچ ہے اور تکلیف دور کرتا ہے۔ جس نے اذان کے کلمات دو دفعہ کہے لیکن اقامت میں ایک ایک دفعہ کہے تو اس پر گناہ نہیں۔ اسی طرح اذان میں بھی دو دفعہ کلمات کہے اور اقامت میں بھی تو اس پر لوگ نہ ایک دوسرے کو عار دلاتے ہیں اور نہ عیب نکالتے ہیں۔ یہ بات تم عیاں آتم خود ہی دیکھ رہے ہو اور ہمارے اس بیان کے گواہ ہو۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو ہماری کتاب کی کسی آیت یا ہمارے نبی ﷺ کے کسی ارشاد کی تاویل میں ہو۔ حالانکہ ہم خدا کی طرف سے آیت کے نزول پر اور حدیث کی صحت پر متفق ہیں اگر تمہاری وحشت کا سبب یہ ہوا ہو اور اسی وجہ سے تم ہماری کتاب کا انکار کرتے ہو۔ تو پھر تورات اور انجیل پر بھی ایسا ہی اتفاق ہونا چاہیے جیسا کہ ان کے الفاظ کا خدا کی طرف سے ہونے پر اتفاق ہے اور یوں یہود و نصاریٰ میں تفسیر کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے..... اگر اللہ

چاہتا کہ کتاب ایسی نازل کرے اور انبیاء اور ان کے تابعوں کے اقوال اس پنج پر ہوں کہ تفسیر میں کوئی اختلاف نہ ہو سکے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن ہم دینی اور دنیوی امور میں ایسا کہیں نہیں دیکھتے کہ خدا نے وہ چیز اتاری ہو جو ہر حال میں کفایت کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو آزمائش اور محنت نہ رہتی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور مقابلے پر کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوتا، اس پر وہ شخص پھر اسلام لے آیا۔ اور امیر المومنین نے سجدہ شکر ادا کر کے حاضرین سے فرمایا آج اس پر روپیہ دے کر کچھ احسان مت کرنا تاکہ اس کا اسلام آزاد نہ ہو۔ اور اس کا دشمن یہ نہ کہہ سکے کہ لالچ کے سبب مسلمان ہوا۔ مگر آئندہ اس کے ساتھ بھلائی کرنے اسے امداد دینے اور اس کا دل بھانے میں کسرت رکھنا۔ (بخاری، ج ۱، ص ۳۸۱)

امیر المومنین المامون نے اس حسن کے ساتھ یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ فقہاء اور متکلمین کے جو اختلافات ہیں ان سے علم میں ارتقا ہوتا ہے لیکن یہ اختلاف فرقہ بازی کا موجب نہیں ہونا چاہیے اور جماعت کی مضبوطی اور امت کی وحدت پر حرف نہیں آنا چاہیے اور نہ ایسی کوئی حرکت ہونی چاہیے جس سے مسلمانوں کا حال و استقبال تباہ ہونے کا خطرہ ہو۔ یہ جو بات بات پر کفر کے فتوے لگتے ہیں حتیٰ کہ مسجدیں بھی الگ الگ کر لی ہیں اور ایک دوسرے کے بزرگوں پر سب و شتم کا بازار گرم ہے۔ اس کی اجازت نہیں، جو لوگ یہ حرکت کریں اور تخاب گروہ بن کر امت کا کلمہ متفرق کریں، ان سے نبی ﷺ کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِىْ شَيْءٍ (الانعام: ۱۵۹) (جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے (اے نبی) تمہارا ان سے کسی معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔)

سب اپنے اپنے فقہی اور کلامی مسائل پر قائم رہیں۔ مگر ایسی باتوں سے احتراز کریں جو دوسروں کے لیے موجب اذیت ہوں اور منافرت پھیلے تو ہمیں حکم ہے کہ کلمے کی حرمت برقرار رکھیں۔ ارشاد نبوی ہے:

عن انس قال قال رسول الله ﷺ من صلى صلوٰتہ و استقبل قبلتہ

واكل ذبحینا فذلک المسلم الذی له ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ فلا

تحقروا اللہ فری ذمۃ۔ (رواہ البخاری)

احضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ہماری طرح نماز پڑھی۔ ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارے ہاتھ کا بیچ کھلایا تو یہ شخص ایسا مسلمان ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں تم اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری پر حرف مت لاؤ۔]

لیکن جب یہ ہی شخص قرآن پاک کے کلمات میں رد و بدل اور تحریف ثابت کرنا چاہے، مہاجرین اور انصار کو مرتد کہے اور ان کی راہ سے ہٹ کر چلے اور دین میں وہ باتیں نکالے جو اس میں نہیں اور پھر اپنا جھٹا الگ بنا کر امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے تو اس پر مذکورہ بالا تعریف صادق نہیں آتی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعید رکھی ہے:

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل

المؤمنين نوله ماتولى ونصله جهنم وساءت مصيراً.

[جس نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی حالانکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی تھی اور ایسی چال چلا جو اہل ایمان کی راہ نہیں تو ہم بھی اس کا منہ اسی طرف پھیر دیں گے جدھر اس نے رخ کر رکھا ہو۔ اور پھر اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔]

ایک قابل توجہ جائزہ

اموی اور عباسی خلافتوں کے دینی اور آئینی حیثیت کم کرنے کی بعض مورخوں و مصنف کتنی ہی کوشش کر لیں۔ روایات و اہیہ کو حقائق کا رنگ دینے کے لیے کتنا ہی زور قلم صرف کر دیں یہ صورت حال اپنی جگہ دائم و قائم ہے۔ کہ ان خلافتوں کا نظام قرآن و سنت پر مبنی تھا اور اس کے چلانے والے، اوّل تو اصحاب رسول اللہ ﷺ تھے جن کے اسمائے گرامی ہمیں امیر المؤمنین ولید اوّل کے عہد مبارک و مسعود تک ملتے ہیں جنہوں نے اموی عہد میں مشرق و مغرب

میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ پھر تھے صحابہ کرامؓ کے تربیت دادہ، ان کے مخلص اتباع اور ان کے بعد ان کے اتباع جو ملت اسلامیہ کے عظیم ترین علماء و فقہاء و ائمہ ہیں ۲۵۰ھ تک کا زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے۔ وہ صحابہ کرام اور ان کے اتباع کا عہد ہے اور اسی مدت میں احکام دین کے کلیات و جزئیات پوری طرح مدوّن ہو کر محفوظ ہو گئے۔

اب ایک طرف تو یہ حقیقت ثابت ہے اور دوسری طرف سبائیوں کی اور ان سے متاثر مولفوں کی تحریریں ہیں جو طبعاً ہر صاحب فکر کے دل میں کھرچن پیدا کرتی ہیں کہ یہ قرآن حکیم کیسی آخری کتاب ہے۔ حضور اکرم ﷺ کس طرح کے آخری رسول ہیں اور یہ امت کون سی قسم کی آخری امت ہے کہ اپنے ہادی و مولیٰ ﷺ کا برپا کردہ نظام تیس برس میں اچھی طرح نہ چلا سکی اور پھر اس کا عالم ایسا ابتر ہو گیا کہ غاصبان خلافت کے مظالم سستی رہی حکومت کے ہاتھوں دین مبین کے اصول و قواعد کی پامالی دیکھتی رہی اور صدیوں ان ظالموں اور غاصبوں کے دامن سے عقیدت اور وابستگی کی معصیت میں مبتلا رہنے کو تقاضائے دین باور کرتی رہی اور نام نہاد ”آل رسول“ میں سے جو لوگ ان ظالموں غاصبوں اور دین سے بے پروا حکمرانوں کے بچے استبداد سے نجات دلانے کو بار بار کھڑے ہوئے، ان کی حمایت و نصرت سے اپنا دامن بچاتی رہی۔ اگر اسی پر بس ہوتا تو عالم اسے امت کی بے حسی سمجھ لیتے۔ مگر اس نے تو بے راہ روی کی حد کردی کہ ظالم و غاصب حکمرانوں کے ایک اشارے پر جوق در جوق جان و مال کی بازی لگانے اور ان کی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف جہاد ہو جانا اس کا شعار رہا۔

اس امت کی فرض شناسی کی انتہا یہ ہے کہ جب ”ظالم و جابر“ بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا گیا اور ان میں سے تنہا ایک شخص راہ کے تمام مصائب بھیلتا ہوا اندلس پہنچا تو وہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ یہ ایک دشمن گھرانے کا فرد ہے اور یوں ہسپانیہ میں پھر اسی ظالم و جابر اور دین سے بے بہرہ اموی خاندان کی ایسی حکومت قائم ہو گئی جہاں کئی صدیوں تک وہ علماء و فضلاء پیدا ہوتے رہے جن کی علمی کاوشوں پر مسلمانان عالم کو آج تک کیا کچھ فخر و ناز ہے۔

یہ تھے قریش کے بطل جلیل اور بنی امیہ کے سورا امیر عبدالرحمن الداخل آپ سے

جب اندلس میں دریافت کیا گیا کہ بیعت خلافت کی لینا چاہتے ہیں یا امارت کی تو اس مردِ حق نے فرمایا: ”خلافت کی بیعت مشرق (عراق) میں ہوگئی۔ میں صرف امیر ہوں،“ آپ اگر چاہتے تو اندلس میں حریف خلافت قائم کر سکتے تھے۔ مگر اموی سادات امت مسلمہ کے خادم اور خیر خواہ تھے ان کی لٹہیت نے اجازت نہ دی کہ منصب خلافت کا استخفاف کریں اور جماعت المسلمین کے اجماع کی بے وقعتی کے مرتکب ہوں۔

پھر اس مردِ حق اور شہبازِ صداقت و عظمت کی یہ بات بھی سبائیت زدہ مؤلفین کے لیے خاص کر حیرت انگیز ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے انقلاب آیا۔ اس کے خاندان کی حکومت چلی گئی لیکن ہسپانیہ جا کر اس نے ان بہیمانہ حرکتوں میں سے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔ جو اموی سادات کرام کی قتل عام، ان کے مقابر کی انہدام اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کے دلہوز مناظر کا خاکہ پیش کرنے میں ابوحنیفہ جیسے کذاب نے ابتدا کی پھر سبائیوں مصنف زورِ قلم صرف کرتے رہے جن سے دوسرے لوگ اپنی کتابوں میں انہی تقلید سے نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو اندلس مورخوں کی تحریروں میں کچھ تو ان کا ذکر ہوتا انقلاب حکومت میں کشت و خون اتنا ہی ہوا جتنا فوجی انقلاب میں عموماً ہوتا ہے اس سے زیادہ سب کذب محض ہے۔

علاوہ ازیں اس امت کی یہ بات بھی ہر دل میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ جب تاتاریوں کے ساتھ سبائی رافضیوں کی ساز باز کے نتیجے میں خلافت عباسیہ مشرق میں ختم ہوئی۔ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تو پھر بھی اطمینان کا سانس لینے کے بجائے مسلمانوں نے ضروری یہ سمجھا کہ نئے سرے سے انھی ”ظالم و غاصب“ عباسیوں کی خلافت مصر میں قائم کی جائے۔ حالانکہ ان خلفاء کے ہاتھ میں اب فوجی و حربی طاقت بھی نہیں رہی تھی مگر عالم اسلام میں انھی خلفاء کو پیشوائے امت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ سلاطین ہند کے کتبوں اور سکوں میں ان کے اپنے لقب کے ساتھ تقسیم امیر المومنین، نائب امیر المومنین لکھے جاتے تھے، اور بعض کتبوں میں خلیفہ عباسی کے نام کی صراحت بھی تھی۔ شاہانِ دہلی کے علاوہ سلاطین بنگالہ، سلاطین مالوہ و بہمنیہ دکن

و جو پور سب کی عقیدت کی یہ کیفیت تھی وہ انہی کو مستقل بادشاہ و سلطان نہیں جانتے تھے بلکہ عباسی خلیفہ زماں کا نائب اپنے کو سمجھتے اور کہتے تھے سلطان محمد تخلق شاہ کو اس بارے میں جو غلط تھا۔ ضیاء برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ابتدائی فقرات ملاحظہ ہوں:

در خاطر سلطان افتاد کہ سلطنت و امارت سلاطین بے امر دادن
خلیفہ کہ از آل عباس بود درست نیست و ہر بادشاہی کہ بے
منشور خلفائ عباسی بادشاہی کردہ است یابادشاہی کند متغلب
بودہ است و متغلب بود۔

[سلطان (محمد تخلق شاہ) کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر سلطنت
و حکومت جائز نہیں۔ جن بادشاہوں نے خلفائے عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت
کی ہے یا آئندہ کریں وہ غاصب تھے اور غاصب ہوں گے۔]

چنانچہ ۷۲۴ھ میں سلطان مذکور کی عرضداشت پر دربار خلافت عباسیہ مصر سے جب
خلعت و لوائے سلطنت اور فرمان آیا سلطان نے تمام اراکین دولت و علماء و مشائخ کے ساتھ شہر
سے باہر نکل کر استقبال کیا اور سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا۔ اس کے درباری
شاعر بدر چاچ نے متعدد قصائد اس بارے میں لکھے ایک قصیدے کے یہ چند شعر سنئے۔ کہتا ہے:

اوشہنشاہ شریعت بود منشور ش کتاب

ایس زمان قائم مقام او امام اکبرست

شاہ ابن احمد ابو العباس امیر المومنین

آنکہ آل دودہ عباس را سردفتر است

آفتاب شرع و ملت آسمان ملک و دین

آنکہ مرتخت خلافت را جمالش زیور است

[نوٹ: پہلے مصر میں ”او“ سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں اور ”کتاب“ سے مراد

قرآن کریم ہے چوتھے مصرعہ میں ”دودہ عباس“ سے مراد عباسی خلیفہ ہیں۔]

تقریباً ساڑھے تین صدی بعد آخری عباسی خلیفہ مصر نے ۹۲۳ھ میں ترکی آل عثمان کے سلطان سلیم کو یہ منصب جلیلہ سپرد کر دیا تھا۔ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک ترکی سلاطین بحیثیت امیر المومنین عیسائی حکومتوں کی نظروں میں خارجی طرح کھٹکتے تھے۔ شریف حسین کو آلہ کار بنا کر دشمن اسلام قوتوں نے ترکی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا مسلمانان ہند میں جو ہجیان و شور و شغب سالہا سال تک ہوتا رہا وہ اسی شیفتگی کی بنا پر جو مسلمانان عالم کی اس مرکزی قوت سے تھی اب سوچنا چاہیے کہ ملت اسلامیہ کی یہ عقیدت اور شیفتگی خاص کراموی عباسی خلافتوں سے کیوں رہی اور بقول سبائیت زدہ اہل قلم جن ”آل رسول“ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے عباسی خلافت کفار تیار کے ہاتھوں ختم کرادی گئی اور جن ”آل رسول“ کی خلافت قائم کرنے کے لیے ابن علقمی و نصیر طوسی جیسے رافض نے ہلاکو کے نڈی دل کو خفیہ سازشوں سے بلایا تھا ان کی خلافت کیوں نہ قائم ہو سکی۔ نیز شریف حسین نے ”آل رسول“ کی خلافت قائم کرنے کے لیے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ وہ کیوں مرتب ہوا جو دنیا دیکھ رہی ہے۔ ان امور پر اگر غور کر لیا جائے اور جاہلی تعصب کی عینک کچھ دیر کے لیے آدمی اتار دے، اس پر کھل جائے کہ امت مسلمہ میں کامیابی اسے ملتی ہے جو قواعد دینیہ کی پاس داری کرے، آداب سیاست و جہا بنانی سے بہرہ ور ہو۔ رائے عامہ اپنے حق میں استوار کرے اور ملت کے سامنے کوئی واضح تعمیری نصب العین رکھے۔

یہ سبب ہے کہ جو علوی اشخاص کے خرو جوں میں نہ عامۃ المسلمین نے کبھی ساتھ دیا اور نہ علماء و فقہاء نے حکومت قائمہ کے خلاف باغیانہ اقدامات کی کسی نہج تائید کی علویوں کی پیہم شکستوں اور نا کامیوں کو حفظ دین کے لیے ایثار و قربانی کا رنگ دینے کو ملاحظہ ہوں کیسے کیسے مہمل تراشے گئے۔ امیر المومنین ہشام جیسے نیک صفات خلیفہ کے خلاف زید بن الحسن جو باغیانہ اقدام میں مارے گئے تھے ان کی تقدیس میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بول کر ایک اکذب الاحادیث وضع کر ڈالی (ترجمہ بحوالہ الاسلام الصحیح، ص ۲۰، طبع بیروت ۱۳۵۴ھ)

”نبی ﷺ کی نگاہ زید بن حارثہ کی طرف اٹھی تو فرمایا (میرے اہل بیت میں سے ایک مظلوم کا یہی نام ہوگا۔ اللہ کی راہ پر قتل ہونے والے اور میری امت میں سے

سولی پر لٹکائے جانے والے کا یہی نام ہوگا) زید بن حارثہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: زید مجھ سے اور قریب ہو جاؤ۔ اللہ تمہاری محبت میرے دل میں اور زیادہ کرے کیونکہ تمہارا نام میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے زید کا ہے۔“

یہ زید جنہیں کذاب راوی نے حضور رسالت مآب ﷺ سے منسوب الفاظ میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے کہلویا ہے حضرت حسینؑ کے پوتے تھے جو حضور اکرم ﷺ کے وقت رحلت فرمانے سے نصف صدی سے زیادہ عرصے بعد تولد ہوئے اور آپ کی وفات سے ایک سو بارہ برس بعد حکومت قائمہ کے خلاف بغاوت میں مارے گئے۔ ان صاحب کو جو احکام شریعت کی خلاف ورزی میں جماعت سے علیحدہ ہو کر بغاوت میں مقتول ہوئے ”زید شہید“ کہا گیا۔ پھر ان زید سے کوئی بیس بائیس سال بعد حکومت قائمہ کے خلاف دوسرے علوی فرد محمد نام الارقط لقب نے ۱۴۵ھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ باغیانہ اقدام کی کامیابی کے واسطے ضعیف الاعتقاد عوام کو بہکانے کے لیے اپنے آپ کو ”مہدی“ کہا اور کہلویا ان کے بھی اسی طرح مقتول ہونے پر سبائی راوی نے دیو مالائی قماش کی یہ جھوٹی کہانی گھڑ ڈالی کہ محمد الارقط کے بغاوت میں مارے جانے سے ایک سو پینتیس برس پہلے ہی حضور اکرم ﷺ نے ان کے مقتل گاہ پر جمع جماعت صحابہ نماز جنازہ پڑھ کر فرمایا تھا کہ یہاں میری اولاد سے ایک ”نفس زکیہ“ مقتول ہوگا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مفروضہ مظالم میں ”نفس الزکیہ“ کا پروپیگنڈا اس شدت سے کیا گیا کہ نام کے بجائے یہی سبائی لقب اب بھی مودودی صاحب جیسے ”مفکر اسلام“ کی زبان قلم سے بار بار ادا ہوتا ہے۔ خیر القرون کے مسلمان ”اہل رسول“ کی حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کے صلب مطہر سے چار صاحبزادے ہوئے جو سب بچپن میں فوت ہو گئے۔ آپ کے کسی فرزند کا سن بلوغت میں آنا منشاء الہی میں نہ تھا فرمادیا گیا: وما کان محمد اباً احد من رجالکم ولكن رسول اللہ وخاتم النبیین (اور محمد تم میں سے کسی ایک مرد کے بھی باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین) چاروں فرزندان رسول اللہ قاسم، طاہر، عبد اللہ ابراہیم کا بچپن ہی میں وفات پا جانا بین ثبوت ہے کہ اس

دنیا میں نہ کوئی فرزند رسول اللہ ہے اور نہ ابناء رسول کی کوئی ذریت خلافت کا راز بھی اسی میں پنہاں سمجھے کہ وہم وراثت میں نہ پیدا کہیں ہو۔

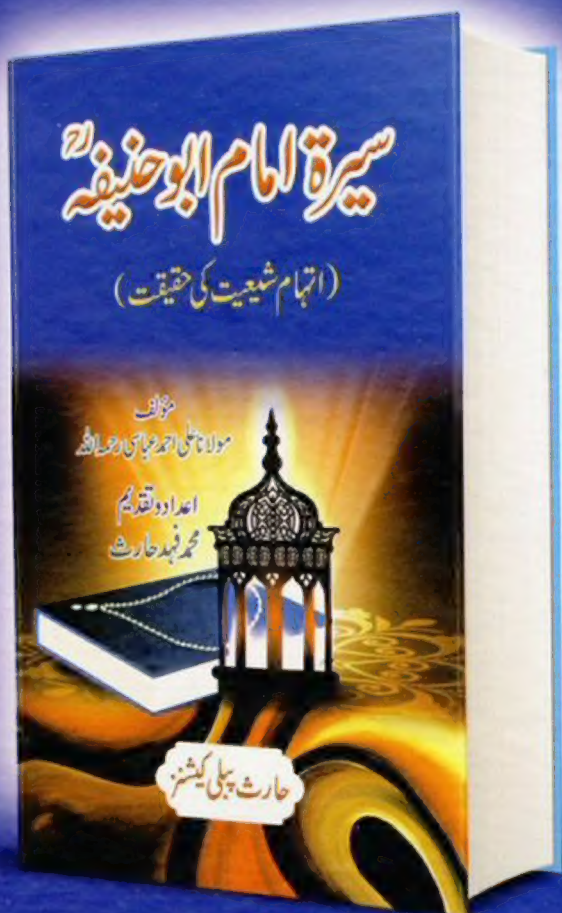
جو زندہ رہا ہوتا بیٹا نبیؐ کا عجب کیا وہ کرتا وراثت کا دعویٰ
نہ اٹھنا وہ خود تو کوئی اور اٹھاتا نواسوں کی تاریخ کو دیکھے دنیا
نواسوں کی تاریخ مظہر ہے اس کی کہ بیٹے نبیؐ کے رہے کیوں نہ باقی
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اولاد علیؑ کے ادعائے خلافت کے سلسلے میں اپنے

مخصوص طرز سے اظہار حقیقت ان الفاظ میں کر دیا ہے۔ (ازالۃ الخلفاء، ج ۱، ص ۲۸۴)

در عنایت ازلی مقرر بود کہ هیچگاه حضرت مرتضیٰ و اولاد
او تاد امان قیامت منصور نہ شوند و هیچ گاہ خلافت ایشان علیٰ
وجہا صورت نہ گیرد بلکہ از میان ایشان ہر کہ دعوت بخود کند
و بقتال برآرد مخذول بلکہ مقتول گردد۔ خدا تعالیٰ مے
فرماید: ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین۔ انہم لہم المنصورون
وان جندنا لہم الغالبون۔

(وللخلفاء الذین ہم خلفاء الانبیاء حقا اسوۃ المرسلین فہم
المنصورون وہم الغالبون)۔





Rs. 400/=

حارث پبلی کیشنز